انجمِ تاباں

(ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجمؔ کی علمی وادبی خدمات کا تحقیقی مطالعہ)

سہیل انجم

انجمِ تاباں

(ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی علمی وادبی خدمات کا تحقیقی مطالعہ)

سہیل انجم

یہ کتاب
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

(ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجؔم کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی مطالعہ)

مصنف :

سہیل انجم

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : **انجمِ تاباں**

مصنّف و ناشر: سہیل انجم

پتہ : 370/6A، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025
(Ph: 9818195929, 011-26982601)

تعداد : 400

قیمت : -/120 روپے

سالِ اشاعت : 2013

کمپوزنگ : سلمان فیصل، نئی دہلی

مطبع : نسیم اسلامک بک سینٹر۔ M. : 9717334642

ناشر : سہیل انجم

370/6A، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

ملنے کے پتے:

۱۔ سہیل انجم، 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی 110025

۲۔ حماد انجم ایڈووکیٹ، کرنجوت بازار، پوسٹ لوہرسن، ضلع سنت کبیر نگر، اتر پردیش

۳۔ مکتبہ نواء اسلام، A 1164 گلی چاہ رہٹ، جامع مسجد دہلی 110006

انتساب

والدہ مرحومہ کے نام

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

فہرست

○○

چند باتیں

سہیل انجم

یہ کتاب ''انجم تاباں'' کم و بیش ایک سال قبل چھپ جانی چاہیے تھی لیکن بعض مجبوریوں اور دشواریوں کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکی۔ اب جبکہ موضوع کتاب یعنی ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم اس دنیا میں نہیں ہیں، یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ ان کا 17 فروری 2013 کو ان کے آبائی وطن کرنجوت بازار ضلع سنت کبیر نگر اتر پردیش میں انتقال ہو گیا ہے۔ تاہم اس تاخیر کی وجہ سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ مزید بڑھ گئی ہے۔

گزشتہ کچھ برسوں سے مولانا حامد الانصاری انجم کا رشتہ لوح و قلم سے منقطع ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً تین دہائی قبل ایک دردناک حادثے کے سبب ذہنی و دماغی اضطراب میں مبتلا تھے اور اپنی علمی سرگرمیوں سے بدرجہ مجبوری کنارہ کش تھے۔ ایک طرح سے وہ اس دوران علمی دنیا سے کٹے رہے اور بظاہر ''گمنامی'' کی زندگی گزارتے رہے۔ لیکن ان کے انتقال سے پورے ملک کے اخباروں میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے تقریباً تمام اردو اخباروں اور بعض انگریزی اور ہندی کے اخباروں نے بھی ان کے انتقال کی خبر اور تعزیتی نشستوں کی رپورٹیں تواتر کے ساتھ شائع کیں اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ متعدد سیاسی، دینی و ادبی مجلوں اور رسالوں نے ان پر خصوصی مضامین شائع کیے۔ یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ ان کے متعدد مداح، شاگرد اور دوست ان کی شخصیت اور دینی، علمی و ادبی خدمات پر مضامین قلمبند کر رہے ہیں۔ ان مضامین کو ایک کتابی صورت میں الگ سے شائع کیا جائے گا۔

اس کتاب میں ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی

مطالعہ کیا گیا ہے جس میں ان کی شخصیت کے بھی کئی پہلو سامنے آئے ہیں اور کسی حد تک ان کی ذات پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کا مقدمہ حضرت مولانا صلاح الدین مقبول احمد، کویت نے تحریر فرمایا ہے جو کہ مولانا انجم صاحب کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۔ چونکہ یہ کتاب اب مولانا موصوف کے انتقال کے بعد شائع ہو رہی ہے اس لیے اس میں ایک مضمون اس حوالے سے بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ملک کے مقتدر دینی رسالہ ''نوائے اسلام'' دہلی کے مدیر حضرت مولانا عزیز عمر سلفی نے تحریر فرمایا ہے۔ دراصل یہ نوائے اسلام کا اداریہ ہے جو مولانا کے انتقال کے بعد شائع ہوا ہے۔ مارچ 2013 کے اس شمارے میں مولانا مرحوم پر دیگر کئی مضامین بھی شامل ہیں۔

''انجم تاباں'' میں ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی حمدیہ، نعتیہ اور اسلامی شاعری اور غزلیہ شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ مولانا مرحوم متنوع الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک عالم دین، سحر البیان خطیب، جادو بیان مقرر، شاعر، مناظر، ناظم، صحافی اور صاحب طرز ادیب تھے۔ انھیں غلو سے پاک نعتیہ شاعری کرنے کی وجہ سے ''حسان الہند'' کہا جاتا تھا۔ ایک عرصے سے انھوں نے شاعری ترک کر دی تھی۔ لیکن انتقال سے کچھ دنوں قبل وہ یہ شعر اکثر و بیشتر گنگناتے ہوئے سنے گئے تھے: التجا تجھ سے ہے ترحم کی، لاج رکھ لے غریب انجم کی۔ گویا یہ ان کی بیاض کا نقش آخر ہے۔

یہ کتاب ایک طرح سے مولانا مرحوم اور ان کی خدمات کو خراج عقیدت ہے۔ حالانکہ ان کے کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے اور اس کتاب میں تمام کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ پھر بھی یہ ایک ادنی سی کوشش ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو قبول فرمائے۔ (مصنف، سہیل انجم، ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ جبکہ معروف ادیب و شاعر حماد انجم ایڈووکیٹ، قمر جمال انجم، آصف ہلال انجم اور ڈاکٹر شمس کمال انجم بھی ان کے صاحبزادگان ہیں)۔

○○

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم

مولانا عزیز عمر سلفی، ایڈیٹر نوائے اسلام دہلی

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم ہندوستان کے چوٹی کے علماء کی فہرست میں نمایاں تھے ۔ وہ زبان و بیان اور نگارشات قلم کے بادشاہ تھے۔ نعت گوئی میں حسان الہند تھے۔ تقریر و خطابت میں آبشاروں کے نغمے اور دریاؤں کی روانی تھے۔ وہ الفاظ کے بحر ناپیدہ کنار تھے۔ ان کی تحریریں جذبات کے جادو جگاتی تھیں۔ وہ ایسے مداح رسولؐ تھے جن کی نعتوں کی خوشبو لامحدود حلقوں تک پھیلی ہوئی ہے ۔ وہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب کر نعتیہ نظمیں اس احتیاط کے ساتھ لکھتے تھے کہ توحید و رسالت کا فرق قائم و دائم رہے۔ اسی لئے وہ حسان الہند اور مداح رسولؐ تھے۔ خادم دین اور خادم رسولؐ تھے۔

یوں تو وہ انجم تھے لیکن ان کی ذات سراپا انجمن تھی۔ وہ حوصلہ مند اور پُر بہار اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مایوسی و نامرادی، بے حسی و بے عملی، سستی و غفلت، افسردگی و شکستگی کو گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے پاس حوصلوں کی بجلیاں تھیں ۔ وہ موج بے کراں تھے۔ وہ تیز گام تھے ۔ وہ فرزندان اسلام کے عزت و ناموس کے متلاشی تھے۔ ذوق وشوق اور عزم و حوصلہ کو جوان رکھنے کیلئے ہمیشہ بگل بجاتے رہے۔ راہ منزل میں آبلہ پا ہوکر، شکستہ دل ہوکر یا شکستہ دست و پا ہوکر کھڑے رہنا ان کو گوارہ نہیں تھا۔ کھڑے ہوکر ستانا بھی ان کے مزاج اور فکر و عقیدہ کے خلاف بات تھی۔

ان کا مقصد حیات ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام میں بانگ درا کی صورت میں نمایاں اور روشن ہے۔ انجم صاحب نے چھوٹی جگہوں پر مگر بڑے نیک اور اولیاء صفت

اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی اوران سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔انھوں نے مدرسہ ریاض العلوم دہلی میں مولانا عبدالسلام بستویؒ سے شرف تلمذ حاصل کیااور سند فراغت پائی۔ وہ مدرسہ امینیہ دہلی میں مفتی کفایت اللہ سے بھی مستفید اور مستفیض ہوتے رہے۔ اس کے بعد دہلی میں طبیہ کالج سے فاضل طب و جراحت کی ڈگری حاصل کی اور پھر 1955 میں جب وطن مالوف کرنجوت بازار، لوہرسن لوٹے تو بزم سخن پر چھا جانے کیلئے دہلی سے اردو معلّٰی کی سوغات بھی ساتھ لے گئے ۔وہ حمد ونعت کے علاوہ معیاری نظموں سے دلوں کو شاد کام بنانے لگے۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام بستوی رحمہ اللہ کی خواہش اور تلقین کے مطابق آپ نے بھی گاؤں اور دیہات کوتعلیم و دعوت کا مرکز بنایا۔ متعدد مدارس و مکاتب قائم کیے ۔ متعددمدارس اور اداروں کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ (اس وقت کے مدارس کے قیام اور اداروں کی ذمہ داریاں موجودہ دور کے تناظر میں نہیں دیکھنی چاہئیں۔ اس دور میں اس سنگلاخ وادی کو عبور کرنا ہرکس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی)۔

ایسے وقت میں جبکہ ان کی تعلیمی خدمات کا سلسلہ شباب پر تھا، گوتم بدھ کی جائے پیدائش لمبنی کے مضافات کے بیسیوں گاؤں کوایک ماسٹر پلان کے تحت حکومت نیپال نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ان مواضعات کو آبادیوں سے خالی کرالیا گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ خانہ بدوش ہوگئے جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ان کی مسجدیں و مدارس ختم ہوگئے۔ جابجا پھوس اور چھپروں کی بستیاں تیار ہوگئیں مگر وہ مساجد و مدارس سے خالی تھیں۔ان بستیوں کے لیے انجم صاحب اُمید کی کرن بن کر چمکے۔وہ مدارس کی تعمیر میں حد سے بڑھ گئے اور غیر شعوری حالت میں جِنوں کی بستیوں کو پامال کردیا جس کی پاداش میں انھیں اس مخلوق سے مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ تادم حیات ان سے نبرد آزما رہے اور زندگی کا ہتھیار رکھا بھی تو صرف اللہ کے آگے۔

انجم صاحب نہایت درجہ نفیس الطبع، خوش پوش وخوش گو تھے۔ وہ قدرتی مناظر کے شیدائی تھے۔قدرت کے حسین شاہکاروں سے لطف اندوز ہونا ان کی فطرت میں داخل

تھا۔ جنگلات، پہاڑ، دریا، ندی نالے، دریاؤں اور آبشاروں کی روانی، ان کی آواز اور آوازوں کے زیر و بم سب انجم صاحب کی طبیعت اور شخصیت سے ہم آہنگ تھے۔ اور یہ سب چیزیں نیپال کی ترائی میں موجود تھیں جو انجم صاحب کیلئے زندگی بھر سامان کشش بنی رہیں۔

انجم صاحب نے ضلع مہراج گنج میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی اور وہاں محبت کے جلوے بکھیر کر رکھ دیے۔ مہراج گنج ساڑھے 29 کلومیٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا ضلع ہے اور گونا گوں قدرتی مناظر سے گھرا ہوا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ تعلیم و ثقافت سے نا آشنا اور محروم رہا ہے۔ انجم صاحب نے یہاں کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا، ان میں شوق عمل پیدا کیا، ان کو جد و جہد کا راستہ دکھایا۔ ضلع میں جلسے و جلوس اور انجمنوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مٹھی بھر افراد اہلحدیث کی جو دو چار گاؤں میں پائے جاتے تھے، عزت بڑھ گئی۔ ان کی تعلیمی، دینی و دعوتی جد و جہد کے نتیجے میں ضلع کے تمام مکاتب فکر کی بستیوں، اداروں اور مدرسوں میں بھی ان کی نعتوں اور تقریروں کے چرچے ہونے لگے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے شاگردوں کے ایک مدرسہ میں مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی مقرر خاص تھے۔ اس اجلاس کے اشتہار میں انجم صاحب بایں القاب مشتہر تھے:

”رئیس التکلم، فصیح اللسان۔ بلیغ التکلم، نغیض البیان۔ مداح رسولؐ، شاعرِ نغمات۔ ابوالمآثر ڈاکٹر حامدالانصاری انجم جمال اثری بارگاہِ رسالت مآب میں نذرانہ عقیدت پیش فرمائیں گے“۔

یہ اشتہار ہمارے علماء کے اقدار اعلیٰ کا جس قدر معترف ہے، وہ بالکل نمایاں ہے۔ اس سے تمام مکاتب فکر کے حلقوں میں انجم صاحب کی قبولیت عامہ، ادب و احترام اور قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔ ضلع مہراج گنج میں علماء اہل حدیث کی عزت ہمیشہ رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں بزرگوں کی لگائی ہوئی فصلیں ہر سو لہلہا رہی ہیں۔ الحمد لله علی ذالك

انجم صاحب نے اپنی دلچسپیوں سے ضلع مہراج گنج کے کولہوئی بازار اور ترکلوا کے

مضافات کوزندہ وپائندہ بنادیا۔ خالد ملی اسکول تعلیم آباد کا سنگ بنیاد بھی انہیں کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ مہراج گنج نے انہیں ہمیشہ اپنا محسن اور گھر کا عالم سمجھا اور انہیں بے پناہ محبت دی۔ ۲۰۰۸ء میں ضلعی جمعیت اہلحدیث کی جانب سے پہلا اجلاس عام انہیں کی نظامت میں زیر صدارت مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی رحمہ اللہ منعقد ہوا تھا جو اقراء جونیئر ہائی اسکول (اب انٹر کالج) کے زیر اہتمام ہوا تھا، جس میں پورے ضلع کے لوگوں نے ان سے ملاقات کی تھی اور خلوص ومحبت کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اس مبارک موقع پر مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی رحمہ اللہ، انجم صاحبؒ اور مولانا عبدالرحیم امجد صاحب نیپالی اور اس وقت کے صوبائی جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی کے امیر مولانا ابوالعاص وحیدی حفظہم اللہ اور دیگر کئی دینی وملی شخصیات اور اہل علم حضرات نے مجلس الدعوۃ الاسلامیہ (نوائے اسلام) کے تعلیمی نشاطات کو شرف زیارت بخشا تھا جن میں خاص طور پر کلیہ امام ابن قیم کولہوئی، حرا پبلک اسکول (انٹر کالج) نچلول اور حرا گرلس اسکول نچلول، معہد الدینی پپرا قاضی، خالد ملی انٹر کالج تعلیم آباد پرتاول، الحمراء گرلز اسکول تعلیم آباد وغیرہ شامل تھے۔

اس اجلاس کے دو ایک پروگراموں کے بعد مفسر قرآن نے آخرت کیلئے رخت سفر باندھ لیا۔ اور انجم صاحب مذکورہ حادثہ کی وجہ سے خرابی صحت کے شکار ہوتے گئے۔ تمام تر علاج کے باوجود ہزاروں لاکھوں کے جسم وجان میں بجلیاں دوڑانے والے اور زندگی کی لطافتوں کو لٹانے والے، ایمان کی بہاروں کو سجانے والے مولانا انجم صاحب نے تقریباً 85 سال کی بہاریں دیکھ کر اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کردی۔ يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً"

یادش بخیر! بیالیس سال قبل غیر منقسم ضلع گورکھپور کی واحد اہل حدیث درسگاہ مدرسہ تعلیم القرآن والحدیث بھنی میں ۱۹۷۱ء میں ایک اجلاس عام ہوا تھا جس میں بیرون ضلع کے ایک مولوی نے مناظرہ کا چیلنج کردیا۔ مولانا عبدالمبین منظر رحمہ اللہ نے بہت تفصیل کے ساتھ موضوع مناظرہ کو واضح فرمایا اور پھر وہ شخص راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ پھر یہ معاملہ کبھی موضوع بحث نہیں بنا۔ مگر مذکورہ شخص دھیرے دھیرے گاؤں میں قیام

مدرسہ کی آڑ میں گمراہیوں کو ہوا دینے لگا اور اپنا جال پھینکنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہوا یوں کہ انجم صاحب کا ایک پروردہ اور زیر تربیت طالب علم بڑا یلغاری نظم پڑھتا تھا۔ اس وقت قبلہ اول مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن چکا تھا اور عالم اسلام کا زخم ہرا ہرا تھا۔ اس موقع پر بیت المقدس کی بازیابی کے سلسلے میں مولانا انجم صاحب کی ایک نظم ہفت روزہ ''نشیمن'' بنگلور میں شائع ہوئی تھی۔ انجم صاحب نے اپنے شاگرد کو وہ نظم پڑھنے کی نرالی تربیت دی تھی۔ ضلع کی ایک معروف اہلحدیث بستی ترکلوا، پرتاول میں منعقدہ اجلاس میں اس نے ذیل کی نظم پڑھی تھی:

اے مسجد اقصیٰ تجھے ہم لے کے رہیں گے
لے کے رہیں گے تجھے ہم لے کے رہیں گے
مانا کہ خطاکار و گنہ گار ہیں ہم لوگ
دنیا کی نگاہوں میں بہت خوار ہیں ہم لوگ
ہر ایک کو معلوم ہے عظمت بھی ہماری
اے مسجد اقصیٰ تجھے ہم لے کے رہیں گے
ہر ایک پہ بھاری ہے شجاعت بھی ہماری
لے کے رہیں گے، تجھے ہم لے کے رہیں گے

یہ نظم کیا تھی جوش عمل اور جذبہ سوز دروں تھی۔ ہر ایک کا سینہ گرم ہوگیا اور عرصہ تک یہ نظم نوجوانوں اور طلباء کیلئے وظیفہ بنی رہی۔ اس نظم خوانی کی شہرت کے بعد انجم صاحب کے اس پروردہ کو مذکور شخص نے اچک لیا اور طالب علم مذکور کے اہل خانہ احسان مندی اور دینی تربیت کو ذرہ بھر بھی اہمیت نہ دے سکے۔ جس کی وجہ سے ایک اچھا طالب علم 'لم یکم شیئا مذکورۃ' بن کر رہ گیا۔ طالب علم کے ضیاع کا انجم صاحب کو زندگی بھر بڑا املال رہا۔

انجم صاحب نے بہت سے معرکے سر کیے اور بہت سے میدان فتح کیے۔ ان کی پوری زندگی رزم و بزم سے بھری پڑی ہے۔ بحث و مباحثہ، مناظرہ و مقاطعہ ان کی زندگی کا معمول رہا ہے۔ اس سے سماج کے ناپاک عناصر کو صاف کرنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ ان کے مناظرے فاتحانہ شان رکھتے ہیں۔ وہ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے فن مناظرہ سے واقف اور ان کی کتابوں کے بڑے خوشہ چیں تھے۔ انھوں نے سیاسی و سماجی معاملات میں کبھی اپنے اصولوں کا سودہ نہیں کیا، ان سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کا مذہب

بڑھے چلو، بڑھے چلو۔ چلے چلو، چلے چلو' کا تھا۔ ان کا پیغام تھا:

خرد کا ذکر چھوڑ دے جنوں سے اب تو کام لے   اُٹھا کے ساز توڑ دے خوشی سے جام تھام لے
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے   قدم بڑھاؤ دوستو یہ وقت کی پکار ہے

انہیں قربانیوں اور فتح مندیوں کی وجہ سے ہم ان کی روح کو روح پر فتوح سمجھتے ہیں۔

انجم صاحب نئی نسل کے بہت اچھے معمار تھے۔ ان کے ایک ایک جملے مردم سازی اور صالح معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ شعر و سخن کے حوالہ سے مولانا صلاح الدین مقبول احمد حفظہ اللہ کا اعتراف اور سالک بستوی و سلام انجمی سے لے کر مدارس کے متوسط اور کمزور طلباء تک جو تربیت پا کر تعلیم اور دعوت کے میدان میں اپنی پہچان بنائے ہوئے ہیں ان سب میں کسی نہ کسی حد تک انجم صاحب کے رخ انور کی دمک ضرور ملتی ہے۔

○○

انجم تاباں

فضیلۃ الشیخ مولانا صلاح الدین مقبول احمد

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

شاعری سے اگر پیامبری کا کام نہ لیا جائے تو عام حالات میں وہ محض تفریح طبع ہوتی ہے اور روایات کی پابندی نہ ہو تو ذہنی عیاشی کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ پھر ''زلف دراز'' میں الجھے رہنا، کوچہ محبوب میں جاروب کشی کرنا اور ''تیغ ابرو'' سے کشتے کے پشتے لگتے رہنا شاعر کے لیے زندگی بھر کا شیوہ بن جاتا ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ انہی کے فن وفکر کی پذیرائی:

عجب یہ شاعری ہے اور عجب تصویر ہے ان کی
الجھنا گیسوئے محبوب میں تقدیر ہے ان کی
دکھایا کارنامہ تیغ ابرو کے شہیدوں نے
نہیں بڑھنے دیا ان کو کبھی اس سے قصیدوں نے
انہی حضرات سے تاریخ فن تشکیل ہوتی ہے
انہی کے کارناموں کی سدا تحلیل ہوتی ہے

اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بے مقصد ضائع کر کے عمر عزیز یوں ہی گنوا دینا دانشمندی کے خلاف ہے۔ الشعراء یتبعهم الغاؤون. (الشعراء: 244) میں ایسے ہی شعراء کو گمراہوں کی گمراہی کا سبب بتایا گیا ہے۔

ان من البیان لسحرا، و ان من الشعر لحکمة (ابوداؤد) (بعض بیانات میں سحر انگیزی اور بعض اشعار میں حکمت کی نواخیزی ہوتی ہے)۔

یہ ان شعراء کی خصوصیات ہیں جن کے دل ایمان سے لبریز، اللہ کی یاد سے معمور اور وہ عمل صالح کے گرویدہ ہیں۔ قرآن کریم نے ان حضرات کو مذمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ اپنے اپنے دور میں مولانا حالیؔ، مولانا اکبرؔ الہ آبادی اور علامہ اقبالؔ وغیرہ نے شاعری سے پیمبری کا کام لیا ہے۔ جس کے سبب دوسرے شعرا کے مقابلے میں وہ آج تک زندہ و جاوید ہیں۔ علامہ اقبال اسی کی تلقین کرتے ہوئے نغمہ سنج ہیں:

میں شعر کے اسرار سے محروم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے، یا بانگ سرافیل

ہمارے ممدوح ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم نے اسی کاروانِ ذی قدر کے نقش قدم پر چل کر شاعری سے اپنے ماحول میں پیامبری کا فریضہ انجام دیا ہے۔

''مولانا ڈاکٹر ابوالمآثر عبدالحمید حامد الانصاری انجم جمال اثری''

عمر کے مختلف مراحل میں ان کی کنیت اور اسما و القاب شاعری میں ان کی شہرت کے سبب راقم کو بچپن ہی سے یاد ہیں۔ اسماء و القاب کا الہام اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ انجم صاحب کے نام کے سوابق و لواحق در اصل ان کی کتاب زندگی کے نمایاں ابواب ہیں۔ اس تناظر میں کتاب کا نام ''انجم تاباں'' بے حد موزوں ہے۔

دیہات کا دعوتی اجلاس تھا۔ صرف گیس کی روشنی تھی۔ جلسہ گاہ کے باہر کا پورا ماحول تاریکی کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی دوران دل کی گہرائیوں سے ایک نغمہ پھوٹا:

سنا دے صبا! کچھ مدینے کی باتیں
مدینے کی باتیں ہیں جینے کی باتیں

انداز کی دل نشینی، لے کی نغمگی اور حبِّ نبی ﷺ کی عظمت ونفاست نے غنودگی کو دور کرکے پورے ماحول کو مسحور کردیا۔ علامہ اقبال کا شعر اس موقع کے لیے بالکل برمحل ہے:

سونے والے کو جگادے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلادے شعلۂ آواز سے

معلوم ہوا کہ یہ نغمہ سنج تھے مولانا حامد الانصاری انجم (حفظہ اللہ ورعاہ)۔ اسی جلسہ گاہ میں راقم نے انھیں پہلی بار دیکھا اور سنا، یہ اس کی درجہ پنجم (ابتدائی) میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ تقریباً سینتالیس سال کے بعد بھی اس لحنِ داؤدی کی بازگشت سے اس کے کان آشنا ہیں۔

پھر 1986 میں متوسطہ کا طالب علم تھا۔ مدرسہ شمس العلوم سمرا (سدھارتھ نگر، یوپی) کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں ضلع اور بیرون ضلع کے علما وخطباء موجود تھے۔ اس اجلاس میں راقم نے ایک نظم استقبالیہ پیش کی۔ اس پر ناظم اجلاس کی حیثیت سے تبصرہ کرتے ہوئے انجم صاحب نے فرمایا تھا کہ:

''یہ بچہ اگر شاعری کرتا رہا تو اپنے دور کا اقبال ہوگا''

اس واقعے کا تذکرہ اس وقت مدرسہ شمس العلوم کے مدرس استاذ گرامی مولانا عبدالعلیم ماہر (حفظہ اللہ) نے بھی اپنی تقریظ میں کیا تھا۔ (مسدس شاہراہ دعوت: ۱۲-۴۱)۔ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کی شاعری پر مولانا انجم صاحب کے تبصرے کے تقریباً ۴۴ سال کے بعد ساڑھے تین ہزار کلومیٹر کی مسافت پر بیٹھ کر وہ خودان سے متعلق کتاب پر مقدمہ لکھ رہا ہے۔ وللہ الحمد۔

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

مدینہ یونیورسٹی کے لیے رخت سفر باندھتے ہوئے 1978 میں راقم نے شاعری

کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ پھر سالہا سال کے بعد ادھر تھوڑی سی توجہ ہوئی۔ اب چھوٹے تین مجموعے شائع ہو گئے ہیں اور ایک زیر طبع ہے۔

فاضل گرامی مولانا انجم صاحب (حفظہ اللہ) کے تذکرے میں راقم کا اپنا تذکرہ بس ویسے ہی ہے جیسے شاعر کا قول:

بڑا ہشیار ہوتا ہے بہ کار خویش دیوانہ
ملا دیتا ہے ان کے حسن میں اپنا بھی افسانہ

جناب انجم صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر، سحر البیان خطیب، بہترین انشاء پرداز اور صحافی رہے ہیں۔ لیکن جلسوں اور کانفرنسوں میں ان کی شہرت بحیثیت شاعر زیادہ رہی۔ حمدیہ و نعتیہ شاعری اور بچوں کے لیے نغمے ان کا طرہ امتیاز ہیں۔ ان کی ولولہ انگیز نظموں میں انقلابی آہنگ اور جذبات کی فراوانی ہے۔

نعت گوئی اپنے رموز و اوقاف اور اصول و ضوابط کے سبب شاعری کی نازک ترین صنف ہے جن کی پابندی صحیح طور پر رتبہ نبوت کا شناسا، صحیح عقیدہ و فکر کا علم بردار اور پختہ کار عالم دین ہی کر سکتا ہے۔ مولانا انجم نے اتباع سنت اور حب نبوی کے جذبے سے سرشار ہو کر اس صنف کو جس خوبی سے نباہا ہے وہ انہی کا حصہ رہا ہے۔

راقم کو یاد ہے بچپن میں اپنے مدارس کے اندر مولانا کے شعری مجموعے (بطور خاص نعتیہ) طلبہ کے لیے زاد راہ تھے۔ آج بھی ان مجموعوں کی اشاعت وقت کی ضرورت ہے۔

انجم صاحب کی شاعری کی خصوصیات

☆ قلبی واردات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔

☆ انقلابی آہنگ ایسا کہ حالات سے سمجھوتہ نہیں، بلکہ ان سے نبرد آزما ہو کر اپنا حق حاصل کرنا ایک فریضہ سمجھتے ہیں۔

☆ عقیدہ و فکر، تہذیب و تمدن، تعلیم و تربیت، اخلاق و آداب اور اپنی اسلامی

روایتوں کی پاسداری ہی نہیں بلکہ ان کی علمبرداری ان کا مطمح نظر ہے۔

☆ اسلاف کی روایتوں کی پاسداری کے ساتھ ان کے اندرون میں عصری شعور کی بیداری ان کی شخصیت کا ناقابل فراموش پہلو ہے جس کا اثر اپنی روایتوں سے وابستگی کے ساتھ صاحبزادگان پر ظاہر ہے۔

☆ سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ کا استعمال اور ابہام و پیچیدگی سے دوری۔

☆ الفاظ کے دروبست پر قادر اور اس کے نتیجے میں برجستگی اور ہم آہنگی۔

☆ تلخ و شیریں مشاہدات اور ذاتی تجربات کا پرتو۔

☆ مختلف میدان ہائے زندگی میں شکست و ریخت کا جائزہ اور تدارک۔

☆ عقیدہ و فکر اور اخلاق و روایات کی نشر و اشاعت اور ان کی پیامبری۔

☆ لہجے میں یقین و اعتماد اور جذبات کی فراوانی۔

ڈاکٹر مولانا انجم صاحب بحیثیت شاعر اور ان کی شاعری کی خصوصیات ان کی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ انھیں اشعار سے ضرور مدلل کیا جاتا لیکن یہ کتاب ''انجم تاباں'' اس کے لیے کافی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔

مولانا انجم صاحب کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی شاعری کی خصوصیات کے ساتھ ان کا لحن داؤدی اپنے ماحول میں انھیں دیگر شعرائے کرام سے ممتاز کر دیتا ہے:

بہت معروف ہے محفل میں انجم کی نواخیزی
ہے ان کی نغمگی میں لحن داؤدی کی فیروزی

کتاب ''انجمِ تاباں''

اس کتاب میں ایک طرف بظاہر انجم صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا تعارف ہے تو دوسری طرف روحانی طور پر ان کے صاحبزادہ گرامی مسٹر سہیل انجم کی جانب سے اپنے تخصص میں ''برالوالدین'' (یعنی ان کے حسن سلوک اور صلہ رحمی) کا جذبہ بھی

12184

کارفرما ہے۔

فاضل مصنف کی یہ بھی سعادت مندی ہے کہ کتاب کا انتساب اپنی والدہ گرامی (رحمہا اللہ) کی طرف کرتے ہوئے علامہ اقبال کا مشہور ترین شعر تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے اپنی والدہ کو سب کی والدہ بنادیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اس کتاب میں مصنف کے دلی جذبات نے اس کی ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں میں اضافہ کردیا ہے۔

مصنفِ کتاب:

سینئر صحافی مسٹر سہیل انجم اپنے اخلاق و آداب اور روایات کی پاسداری میں خانوادۂ انجم کے نیّر تاباں ہیں۔ لوح وقلم سے ان کا رشتہ اور ادب وصحافت سے ان کی وابستگی اب پیشہ ورانہ حدود سے آگے بڑھ کر ایک مشن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ بے لاگ تبصروں اور تحقیقاتی تجزیوں کے ذریعے انھوں نے بے شمار حقائق کی پردہ کشائی کی ہے۔ اصول صحافت کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مغربی اور مشرقی میڈیا کو ایسا آئینہ دکھایا ہے جس کی مثال اردو صحافت میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ کاش ان کی تحقیقاتی و تجزیاتی کتاب کے خلاصے ہندی اور انگلش میں بھی تیار کرلیے جاتے۔

سہیل انجم کے بارے میں میرا یہ تبصرہ کسی خوش اعتقادی کی بنیاد پر نہیں بلکہ صحافت اور دیگر موضوعات سے متعلق ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں اور ان پر ملک کے بزرگ اور سربرآوردہ صحافیوں کے حوصلہ افزا تبصرے شاہد عدل ہیں۔ مزید برآں متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں نے صحافت سے متعلق ان کی کتابوں کو داخل نصاب

کر کے، کئی ادبی و علمی اداروں نے ان کی تصنیفات کو انعام و ایوارڈ سے نواز کر اور متعدد ادبی و تحقیقاتی اداروں نے انھیں شائع کر کے فاضل مصنف کے جرأت مندانہ اقدام اور صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

مولانا حامد الانصاری انجم کی تعلیم و تربیت سے وابستگی ہی کہیے کہ ان کے صاحبزادگان میں ڈاکٹر شمس کمال انجم بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں و کشمیر میں شعبۂ عربی کے صدر ہیں۔ اپنے والد گرامی کی حیات و خدمات پر ان کی کتاب ''نقوش جاوداں'' اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ مسٹر حماد انجم (ایڈوکیٹ) پُر گو شاعر ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''خوشہ کشت حرم'' رفیق گرامی مولانا عبد اللہ مدنی نے اپنے مرکز التوحید کرشنا نگر نیپال سے شائع کیا ہے۔ جبکہ دوسرا شعری مجموعہ ''شاخ گل تر'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان کے دیگر مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں جن میں ''بہار حمد'' کے نام سے حمدیہ مجموعہ قابل ذکر ہے۔ راقم نے اپنے منظوم رسالہ ''پاکیزہ شاعری: اہمیت و ضرورت'' میں خانوادۂ انجم کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے شاعری کے حوالے سے لکھا ہے:

بہت معروف ہے محفل میں انجم کی نوا خیزی
ہے ان کی نغمگی میں لحن داؤدی کی فیروزی

ہے پورا خانوادہ ہی کمالی، کیا سنا تم نے
اضافہ کردیا دیوان کا حماد انجم نے

خانوادہ انجم کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی اور ادب و صحافت سے وابستگی اس راقم کی نظر میں والدین گرامی کی تربیت اور دعاؤں کی رہین منت ہیں:

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

صحافت کے حوالے سے ہمارے حلقۂ احباب کی سہیل انجم صاحب سے بڑی آرزوئیں وابستہ ہیں۔ جرأتمندانہ صحافتی خدمات کی سعادت انھیں مبارک ہو۔ اللہ تعالی انھیں سلامت رکھے۔

ایں دعا ازمن واز جملہ جہاں آمین باد!

○○

مختصر تعارف

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم

(مئی 1932۔فروری 2013)

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم تعلیمی اسناد کے مطابق 15 مئی 1932 کو موضع کرنجوت بازار ضلع بستی (موجودہ ضلع سنت کبیر نگر) میں پیدا ہوئے تھے۔بعض دیگر معتبر شہادتوں کے مطابق ان کا سنہ پیدائش 1928 ہے۔ آپ کا انتقال 17 فروری 2013 کو آپ کے آبائی وطن میں صبح ساڑے سات بجے ہوا۔

مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی۔انھوں نے ناظرہ قرآن اور اردو کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد جناب جان محمد انصاری سے پڑھیں۔مکتبی تعلیم سے فراغت کے بعد عربی وفارسی کی تعلیم کے لیے انہوں نے مدرسہ دار العلوم فتح پور تحصیل بانسی ضلع بستی (اب سدھارتھ نگر) میں داخلہ لیا۔فتح پور کے بعد اونچہرا ضلع بستی میں مولانا عبید الرحمٰن صاحب کے مدرسے میں داخل ہوئے۔بعد میں نیپال کی مشہور ومعروف تعلیمی درس گاہ خطیب الاسلام مولانا عبد الرؤف جھنڈانگری کے مدرسہ سراج العلوم جھنڈانگر کا رخ کیا۔ یہاں کچھ ہی دن قیام کرنے کے بعد دوبارہ فتح پور کے مدرسے میں واپس آ گئے اور ہدایہ اولین تک مولانا شمس الحق (شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانی) سے تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد مفتاح العلوم بھٹ پرا میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم سے دیگر فنون کی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ سنن اربعہ، مشکوۃ المصابیح اور جلالین پڑھی۔اعلی دینی تعلیم کی خاطر وہ دہلی چلے گئے اور مدرسہ ریاض العلوم جامع مسجد میں داخلہ لیا اور شیخ الحدیث مولانا

عبد السلام بستوی سے حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں اور وہیں سے 1951 میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مدرسہ امینیہ میں آپ نے مشہور ومعروف عالم دین مفتی کفایت اللہ صاحب سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد بھی آپ کے حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔انھوں نے بلی ماران میں واقع طبیہ کالج میں ایڈمیشن لے لیا جہاں سے آپ نے 1955 میں فاضل الطب والجراحت کی ڈگری حاصل کی۔ صدر الاطباء حکیم محمد الیاس خان رفیق حکیم اجمل خاں، حکیم مظہر الدین اور حکیم محمد مبین جیسے نامی گرامی اطباء وحکماء سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

اخبار ''الجمعیۃ'' دہلی اور ''مدینہ'' بجنور کے مطالعے نے آپ کے اندر شعر گوئی کا شوق پیدا کیا اور اس طرح انھوں نے طبع آزمائی شروع کر دی۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے وطن لوٹ آئے۔ مولانا حامد الانصاری انجم کو اپنے گاؤں میں ایک دینی مدرسے کی کمی محسوس ہوئی اور انھوں نے وہاں ''مدرسہ مدینۃ العلوم'' کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی جو آج بھی قائم ودائم ہے۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک مدرسے کے ذمہ دار نہیں رہے۔ ہند نیپال کے سرحدی ترائی علاقے کو انھوں نے اپنا میدان عمل بنالیا۔ مختلف مقامات پر مدارس کا قیام کیا اور دینی تعلیم کی روشنی پھیلائی۔

وہ کئی مدارس کے ساتھ ساتھ متعدد مساجد کے بھی موسس رہے۔ مولانا انجم صاحب کے گیارہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں بیشتر نعتیہ اور اسلامی نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''چراغ حرم'' کے نام سے 1969 میں شائع ہوا جو بے حد مقبول ہوا اور انتہائی قلیل مدت میں نایاب ہو گیا۔ مقامی شعرا اس کی نقالی کرنے لگے اور جب ایک نو آموز شاعر نے اسی نام سے اپنا نعتیہ مجموعہ شائع کیا تو آپ نے اپنے مجموعہ کا نام بدل کر ''شمع حرم'' رکھ دیا اور اس کی اشاعت 1986 میں عمل میں آئی۔ اس مجموعہ کے پیش لفظ کے شروع میں یہ شعر درج کیا گیا کہ ''اعلان کردو آج سر بزم خاص و عام، شمع حرم ہے اب یہ چراغ حرم نہیں''۔ وہ بھی کچھ دنوں میں نایاب ہو گیا اور ''چراغ

حرم'' کی مانگ برابر جاری رہی۔ بعد میں ''چراغ حرم'' ہی کے نام سے اس کا تیسرا ایڈیشن فروری 2003 میں شائع ہوا۔

آپ کے دیگر مجموعوں کی تفصیل اس طرح ہے: ''منار حرم'' اشاعت اول 1977 اشاعت دوم فروری 2003۔ ''وقت کی پکار'' اشاعت اول 1961 (رسالہ ترجمان) اشاعت دوم 1976، اشاعت سوم ستمبر 2003۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور اسے مولانا نے 1961 میں نوگڑھ ضلع بستی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس میں پڑھا تھا۔ ''بچوں کے نغمے'' 1990۔ ''نغمہ زار انجم'' اکتوبر 2001۔ ''نعت کے پھول'' ستمبر 2004۔ ''لاہوتی نغمے'' ستمبر 2004۔ ''اسلامی ترانے'' ستمبر 2004۔ ''ربط انجم'' نومبر 2004۔ ''مدح صحابہ'' 2006۔ آپ کے غیر مطبوعہ مجموعے اس طرح ہیں: ''تاجدار حرم'' (نعتیہ مجموعہ) ''منبر ومحراب'' (اسلامی نظموں کا مجموعہ) ''کلیات انجم'' (زیر اشاعت) ''سالار بیت الحرام'' (منثور سیرت) ''خطبات انجم'' (تقاریر کا مجموعہ)۔ آپ نے تین اخبارات ورسائل بھی جاری کیے تھے جو یکے بعد دیگرے کئی برسوں تک نکلتے رہے۔ ان کے نام ہیں: الہلال، المؤتمر اور خبر نامہ۔

آپ کی دینی، علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند نے 2004 میں اپنی 28 ویں آل انڈیا کانفرنس منعقدہ پاکوڑ جھارکھنڈ میں تصنیفی سند اور ایوارڈ سے نوازا تھا۔ آپ کی حیات وخدمات پر آپ کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر شمس کمال انجم نے ''نقوش جاوداں'' کے نام سے ایک تذکرہ تصنیف کیا ہے جو 2008 میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ (آپ کے پسماندگان میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔)

○○

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجمؔ

ایک ہمہ جہت شخصیت

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنے آپ میں مکمل اور بھر پور ہے۔ جب میں ان کے اب تک کے سفر حیات پر نظر ڈالتا ہوں تو جگہ جگہ کامیابیوں، کامرانیوں اور عزیمتوں کی بے شمار داستانیں پاتا ہوں۔ ایسی داستانیں جو اولوالعزمی سے عبارت ہیں، عزم وحوصلے سے بھر پور ان کے کردار کی گواہ ہیں اور خود داری وغیرت مندی اور حق گوئی و بیباکی کی عکاس ہیں۔ طبابت ہو یا خطابت، صحافت ہو یا عبادت وریاضت، شاعری ہو یا نثر نگاری۔ اس سفر میں جگہ جگہ ان کے نقوش جلوہ گر ہیں اور دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔

آپ کا پیدائشی نام عبدالحمید تھا۔ بعد میں آپ حامد الانصاری انجم اور انجم جمال اثری سے معروف ہوئے۔ رفتہ رفتہ اول الذکر نام آپ کی شناخت بن گیا۔ تعلیمی اسناد کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش 15 مئی 1932 ہے اور جائے پیدائش موضع کرن جوت بازار ضلع بستی ہے۔ یہ ضلع اب تین اضلاع میں تقسیم ہو کر بستی، سدھارتھ نگر اور سنت کبیر نگر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کرن جوت بازار سنت کبیر نگر میں آ گیا ہے۔ آپ کے والد کا نام میاں صاحب جان محمد انصاری تھا۔ دس سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا اور آپ کے چچا نواب بخش نے آپ کو بیٹے کی طرح پالا۔ آپ کے والد ذی علم اور تقویٰ شعار بزرگ تھے اور درس وتدریس کا کام کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا عالم دین بنے اور وہی ہوا۔ آپ عالم دین بھی بنے اور حکیم وڈاکٹر بھی اور دوسرے میدانوں

میں بھی آپ نے اپنی شخصیت کی بھرپور چھاپ چھوڑی۔ والد کے انتقال کے بعد علاقے کے ایک دینی تعلیمی ادارے میں جو کہ موضع فتح پور میں واقع تھا، آپ کا داخلہ ہوا۔ آپ کے استاد کا نام مولانا شمس الحق شمس بشیری تھا جو کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے رفقا میں سے تھے۔ بعد میں انھوں نے ہند نیپال سرحد پر واقع مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر میں داخلہ لیا اور اس کے بعد وہ مظاہر العلوم سہارنپور چلے گئے۔ پھر دہلی کے مدرسہ ریاض العلوم میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند فراغت حاصل کی۔ اس ادارے نے ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ 1951 میں وہاں سے فراغت کے بعد طبیہ کالج قرول باغ دہلی میں داخل ہوئے اور 1955 میں وہاں سے تکمیل الطب کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے طبابت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اسے بہت کامیابی کے عروج پر پہنچایا۔ لیکن طبیعت میں دینی مزاج تھا لہٰذا طبابت سے دل اچاٹ ہو گیا اور پھر انھوں نے تعلیمی اداروں کی راہ لی۔ اس شعبے میں انھوں نے منتظم اور مدرس کی حیثیت سے قابل ذکر خدمات انجام دیں۔

آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ نئی نسل کو عصری علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے اور اسلامی شاعری، خطابت، صحافت اور وعظ و نصیحت کی مدد سے عوام الناس میں پھیلی ہوئی گمراہیوں کی تاریکی کو دور کرنے میں گزرا۔ صاحب طرز ادیب و صحافی اور شاعر جناب اطہر نقوی کے مطابق، جو کہ دہلی میں آپ کے خاص رفقا میں رہے ہیں، حامد الانصاری نے پیشہ طبابت کو اس لیے خیر باد کہہ دیا کہ ان کے نزدیک جسمانی سے زیادہ روحانی علاج ضروری تھا۔ لہٰذا انھوں نے پیشہ طبابت کو خیر باد کہہ کر سماج میں پھیلے ہوئے غلط قسم کے رسوم و رواج کے اندھیرے کو دور کرنے اور ضلالت و گمراہی کے تار و پود کو منتشر کرنے کے لئے میدانِ عمل میں بے خطر کود پڑنے کو ترجیح دی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ پیشۂ طبابت میں کامیاب نہیں تھے۔ دور دراز سے لوگ آتے اور ان کے دست شفا سے فیضیاب ہو کر جاتے۔ لیکن طبیعت میں ایک بانکپن تھا جو ان کو مستقل مزاجی سے ڈاکٹری کرنے سے روکتا تھا اور بالآخر انھوں نے اس پیشے سے

علاحدگی اختیار کرلی، لیکن اس انداز سے کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر انہیں اس ترک تعلق پر ندامت و پشیمانی نہیں ہوئی۔

انہوں نے اپنا میدان عمل ہند و نیپال کی سرحد پر ترائی کے علاقے کو بنایا اور نوگڑھ، بڑھنی پور، گکرہوا، ٹھوٹھری اور پھر سرزمین نیپال میں ہرنام پور، تینھوا اور دوسرے مواضعات میں سرگرم ہو گئے۔ (لمبنی بودھ مت کا ایک عالمی مرکز ہے) ایک جگہ تعلیمی ادارہ قائم کرتے، عوام میں تعلیمی بیداری پیدا کرتے، لوگوں میں بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے تعلیمی اداروں میں بھیجنے کا ذوق وشوق پروان چڑھاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ آگے بڑھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ البتہ انہوں نے کہیں زیادہ عرصہ گزارا اور کہیں کم۔ اس درمیان ان کے اندر خطابت کا ذوق پیدا ہوا۔ شاعرانہ مزاج نے اس ذوق کو مہمیز لگائی اور پھر تو تین چار گھنٹے تک بیک نشست تقریر کرنا ان کے لئے عام بات تھی اور زبان میں اتنی شیرینی وحلاوت کہ مجال کیا کہ مجمع سے ایک بھی شخص اٹھ جائے۔ ان کی تقریروں میں بلند آہنگ خطابت کا بھی انداز ہوتا تھا اور ترنم آمیز وعظ و نصیحت کا بھی۔ سیکڑوں اشعار نوک زبان پر رہتے اور بوقت ضرورت ان کو استعمال بھی کرتے۔ توحید و رسالت کے موضوع پر بھی اپنی تقریروں میں غزل کے اشعار اس انداز سے استعمال کرتے کہ ایسا لگتا کہ شاعر نے اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا ہے۔

آپ صرف خطابت ہی نہیں کرتے بلکہ حمد اور بالخصوص نعت بھی پڑھتے۔ آپ بہت خوش الحان تھے اور مترنم آواز میں نعت پڑھنے کا انداز لاثانی تھا۔ بھاری بھرکم مگر انتہائی میٹھی آواز اور مردانہ آہنگ کے ساتھ جب نعت پڑھتے تو پورا مجمع جھوم اٹھتا۔ حب رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ان کی نعتیں سامعین پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری کردیتیں اور لوگ ان کی آواز و انداز کے سحر میں ڈوب جاتے۔ آپ کی نعتیں ایسے اشعار سے پوری طرح پاک ہیں جن میں غلو کرکے اللہ کے رسولؐ کا درجہ بڑھا دیا جاتا ہے اور اشعار سے شرک کی بو آنے لگتی ہے۔ آپ فلمی گانوں کی دھن پر نعت پڑھنے کے انتہائی سخت خلاف تھے اور اگر کسی مذہبی جلسے میں کوئی شخص فلمی طرز پر نعت پڑھتا تو اسے سختی سے روک دیتے

کہ یہ رسولؐ خدا کی شان میں گستاخی ہے۔ نعت پڑھنے کا آپ کا انداز اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے انجم ثانی پیدا ہو گئے جو صرف انہی کی نعت اور خالص انہی کے انداز میں پڑھتے اور اپنے نام کے ساتھ انجمی کی نسبت لگاتے۔ آپ کی شاعری خالص اسلامی شاعری ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں آپ نے نعتیں کہی ہیں اور متعدد نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے اسلامی نظمیں بھی بڑی تعداد میں کہی ہیں اور بچوں کی نظموں کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے، جو صرف اور صرف اسلامی رنگ و آہنگ میں ہیں۔

ان مصروفیتوں میں سے وقت نکال کر آپ صحافت بھی کرتے رہے ہیں۔ آپ نے متعدد رسالے جاری کیے جس کی تفصیل اس کتاب میں آپ کو ملے گی۔ دہلی و بیرون دہلی کے متعدد مذہبی اخبارات و جرائد کے صفحات اس کے گواہ ہیں کہ آپ قلمی میدان میں بھی ایک شہسوار کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی تحریروں میں انشا پردازی کا رنگ ہوتا اور مترادفات کا استعمال کر کے اپنی تحریر کو انتہائی دلکش و دلنشین بنا دیتے اور ادبی چاشنی پیدا کر دیتے تھے۔ مترادفات کا استعمال آپ تقریروں میں بھی کرتے اور ایسا لگتا کہ جیسے تقریر اور تحریر دونوں مواقع پر الفاظ ہاتھ باندھے آپ کے سامنے کھڑے ہوں۔ اور شاعری میں مہارت کا یہ عالم کہ غالب کی زبان میں کہیں تو ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں''۔

آپ شاعر و خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ناظم یا اناؤنسر بھی تھے۔ بڑے جلسوں میں آپ نظامت بھی کرتے اور نظامت بھی ایسی کہ کرسی خطابت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے ہی حاضرین و سامعین پر مقرر کی دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ گویا مقرر یا خطیب کی کامیابی میں آپ کی نظامت کا بھی ہاتھ ہوتا۔ آپ کو مشاعروں سے بھی رغبت رہی ہے۔ مگر نعتیہ مشاعروں سے زیادہ شغف رہا۔

آپ جب اپنے گھر کرن جوت بازار ضلع سنت کبیر نگر (سابق ضلع بستی) پہنچتے تو وقتاً فوقتاً یک شبی تقریری پروگرام رکھتے اور بعض اوقات نعتیہ نشست کا بھی اہتمام کرتے۔ جب آپ گاؤں میں آتے تو آپ کے چاہنے والے پروانوں کی مانند شمع کے

اردگرد منڈلانے لگتے اور گاؤں کے ذمہ داران بھی گاؤں میں تقریری نشست کا انعقاد کرتے۔ آپ کی تقریریں اس قدر دلپذیر اور پر تاثیر ہوتیں کہ تمام مسالک ومکاتب فکر کے لوگ آپ کا تقریری پروگرام رکھتے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ اختلافی تقریر نہیں کرتے بلکہ مواضعات میں پھیلی ہوئی شرک و بدعت کی تاریکی کو دور کرنا آپ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب بھی کسی دوسرے گاؤں سے تقریر کی فرمائش آتی تو آپ ضرور جاتے۔ اپنی اصلاحی تقریروں سے سماجی برائیوں کو دور کرنے کی سعی کرتے۔ تقریر کے دوران لوگوں کی توجہ قائم رکھنے کے لئے آپ اچانک کسی کا نام لے کر پوچھ لیتے کہ "فلاں صاحب بتائیے میں کیا کہہ رہا تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس اندیشے میں بھی پوری توجہ سے تقریر سنتے کہ کہیں مولانا صاحب کچھ پوچھ نہ لیں۔

آپ نے صالح معاشرے کے قیام اور غلط رسوم ورواج کو ختم کرنے کی ایک مہم بھی چلائی تھی۔ اس کے لئے آپ نے نوجوانوں کی طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے انہوں نے نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی اور نوجوانوں ہی میں سے صدر، جنرل سکریٹری، سکریٹری اور ممبران کا انتخاب کروایا اور پھر اس بزم کو سماجی اصلاح کی ذمہ داری سونپ دی۔ آپ کا یہ قدم اتنا کامیاب رہا کہ پورا گاؤں پاکیزہ ماحول کے سانچے میں ڈھل گیا۔ اس تنظیم کی شہرت رفتہ رفتہ قرب وجوار میں بھی پھیلنے لگی اور لوگ آ آکر فرمائش کرنے لگے کہ مولانا صاحب آپ ہمارے گاؤں میں بھی ایسی تنظیم قائم کردیجئے۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے اصلاح معاشرہ کا زبردست کام لیا گیا۔

آپ صرف ایک کامیاب اسلامی مقرر ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی تقریروں میں بھی آپ کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انتخابات کے زمانے میں ہفتہ واری بازاروں میں یا انتخابی پروگراموں میں آپ پورے مجمع کو باندھ لیتے اور جس امیدوار کی حمایت میں تقریر کر دیتے اس کی جیت یقینی ہو جاتی۔ لیکن کس امیدوار کی حمایت کرنی ہے اور کس کی مخالفت؟ اس کا فیصلہ آپ پارٹی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس امیدوار کے کردار کی بنیاد پر کرتے تھے۔ امیدوار کو حق وصداقت اور عوامی کاموں کے معیار پر پرکھتے اور جو کھرا اترتا اس کی

حمایت کرتے ۔ جو امیدوار ایماندار ہوتا اور عوامی فلاح و بہبود کے کام میں پیش پیش رہتا، اس کے حق میں انتخابی مہم چلاتے۔ لیکن آپ نے ان سیاسی تقریروں کا کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ ان کا معاوضہ یہی ہوتا کہ امیدوار کامیابی کے بعد عوام کو نہ بھول جائے۔ ایک سیاستداں نے آپ کی طبیعت کے اس رنگ سے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ نہ صرف یہ کہ کئی بار ممبر اسمبلی بنا بلکہ اتر پردیش حکومت میں وزارت بھی حاصل کی۔ لیکن جب اس نے عوام کو فراموش کرنا شروع کر دیا تو آپ نے بھی اس کے نام کو اپنی گڈ بک سے خارج کر دیا۔ مختصر یہ کہ سیاست کی کان میں داخل ہونے کے باوجود آپ کا دامن داغ دار نہیں ہوا اور آپ کی ایمانداری و دیانت داری پر انگلی اٹھانے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔

آپ کے سیاسی نظریات کی اساس عوامی فلاح و بہبود پر تھی اور اس میں وہ کسی مذہب یا فرقہ کی کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عوام کا مفہوم بحیثیت مجموعی عوام سے ہے نہ کہ کسی خاص فرقہ، طبقہ یا مذہب کے لوگوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی مخصوص سیاسی پارٹی کے حامی یا وکیل نہیں رہے۔ بلکہ فلاحی اور عوامی کاموں کی بنیاد پر سیاست دانوں کی حمایت کا فیصلہ کرتے۔ وہ عوامی نمائندوں سے یہ توقع رکھتے تھے اور انہیں اس کی تلقین بھی کرتے تھے کہ ان کا فرض عوام کی خدمت کرنا ہے اپنے مفادات کی تکمیل کرنا نہیں۔ وہ سیاست دانوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر انہیں اپنے مفادات عزیز ہیں اور وہ عوامی مسائل سے کوئی دلچسپی رکھنا نہیں چاہتے تو ان سے تعلق نہ رکھیں اور ان سے کسی حمایت کی امید بھی نہ رکھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے کبھی بھی فاشسٹ طاقتوں کی حمایت نہیں کی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ طاقتیں خواہ کتنی ہی ہمدردی کا مظاہرہ کیوں نہ کریں ان سے کسی خیر کی امید کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ آگ سے پانی نکلنے کی امید کرنا۔ اسی لیے وہ ایسے عناصر سے دور دور رہا کرتے تھے۔ حالانکہ اس قسم کے سیاست داں بھی ان سے قریب ہونے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے لیکن ہر بار ان کے حصے میں مایوسی آتی۔ ان کے سیاسی نظریات میں ایک اہم نظریہ وطنیت کا بھی ہے۔ وہ حب الوطنی کے زبردست مبلغ اور طرفدار ہیں اور کیسے بھی حالات کیوں نہ ہوں

انھوں نے کبھی بھی ہندوستان کے مفادات کے مقابلے میں دوسرے ملکوں کے مفادات کی حمایت نہیں کی۔ وہ علامہ اقبال کے اس نظریے کے قائل رہے ہیں کہ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا۔

بنکر تحریک بھی آپ کی زندگی کا ایک اہم موڑ رہا ہے۔ ۷۰ کی دہائی میں اتر پردیش میں آندھی طوفان کی مانند اٹھنے والی اس تحریک کے جو چند بنیادی کردار تھے، آپ ان میں سے ایک تھے۔ آپ نہ صرف اپنے زور خطابت سے بنکروں کے مسائل اٹھاتے اور انہیں ایوان سیاست میں پہنچاتے بلکہ اپنی نظموں سے بنکر برادری میں زبردست جوش وخروش اور حدت وحرارت بھی پیدا کرتے۔ بنکروں کے لہو کو گرمانے میں آپ کی معرکۃ الآراء نظمیں زبردست رول ادا کرتیں اور اپنے حقوق کے لئے لڑنے اور سڑکوں پر اتر کر ارباب اقتدار سے ٹکر لینے کا حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتیں۔ اس تحریک نے سرکاری ایوانوں میں زلزلہ پیدا کردیا تھا اور ذمہ داران حکومت کو بنکروں کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن انھوں نے اس کامیاب تحریک سے بھی کوئی مادّی فائدہ نہیں اٹھایا۔

حق گوئی و بیباکی تو جیسے آپ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ سلطان جائر کے سامنے حق بات کہنے کا جو حوصلہ ان کے اندر میں نے دیکھا وہ بہت کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔ مصلحت کوشی کس چڑیا کا نام ہے یہ انہیں نہیں معلوم۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کی بیباکی سے خائف اور نالاں رہا کرتے تھے۔ لیکن آپ کسی کی ناراضگی کی پروا کئے بغیر حق بات برسرعام اور بہ بانگ دہل کہنے میں کبھی نہیں جھجکے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے ذاتی بغض وعناد کے سبب کسی کو ناپسند نہیں کیا۔ ہاں وہ ایسے لوگوں کے ضرور دشمن تھے جو ہندوستان کے اور اسلام کے دشمن ہوں اور جن سے اپنے ملک اور اسلام اور امت مسلمہ کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہو۔ آپ کی انہی خوبیوں کے سبب برادران وطن کا بڑا طبقہ بھی آپ کی بے پناہ عزت کرتا اور علاقے میں جب بھی کوئی بڑا سماجی مسئلہ پیدا ہوتا، خواہ فرقہ وارانہ معاملہ ہی کیوں نہ ہو، دوسرے فرقوں کے ذمہ داران آپ سے صلاح ومشورہ کرتے اور کوشش کرتے کہ آپ بیچ میں پڑکر مسئلے کو حل کرائیں۔

آپ کی کتابِ زندگی کے اوراق پر ایسے بے شمار واقعات بکھرے پڑے ہیں۔

آپ کی حیات و خدمات کا یہ محض ایک سرسری جائزہ ہے۔ کتاب میں آپ کی شاعری کے مختلف رنگوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور آپ کی صحافتی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد ایک بہت اچھے شاعر و خطیب، صحافی و طبیب اور سماجی مصلح کی خدمات اور ان کے کارناموں سے، جو کہ ابھی تک زیادہ تر مخفی ہی ہیں، لوگوں کو باخبر کرنا ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکے گا کہ صرف شہری ماحول ہی میں علمی و ادبی اور سماجی خدمات کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے جاتے، دیہی ماحول میں رہ کر بھی نقوشِ زندگی ثبت کیے جا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کو پسند آئے گی۔

○○

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم
بحیثیت نعت گو

جو لوگ نعت گوئی کے نازک ترین رموز و نکات سے واقف ہیں وہ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ نعت گوئی شاعری کا سب سے مشکل فن ہے۔ یہ ایسا فن ہے کہ شاعر سے ذرا سی چوک ہو جائے تو اس کی عاقبت خراب ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی اور قدم حدودِ رسالت سے حدودِ الوہیت میں داخل ہو گئے۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو نعت گوئی کی حدود و قیود میں رہ کر سخن آزمائی کر کے شاعرِ رسولؐ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سنت ادا کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ نعت گوئی کا معاملہ ''ایں سعادت بزورِ بازو نیست'' والا معاملہ ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آج کے شعراء کی اکثریت محض تبرک کے طور پر نعت گوئی کر رہی ہے۔ عموماً شعراء اپنے مجموعہ کلام کے شروع میں ایک ایک عدد حمد اور نعت شامل کر کے محبت خدا اور عقیدت رسولؐ کی رسم ادا کر دیتے ہیں۔ ایسے شعراء کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے جو خالص نعتیہ شاعری کر رہے ہوں اور جنھوں نے اپنی فنی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو نعت گوئی اور مدح صحابہؓ کے لیے وقف کر رکھا ہو۔

ایک محبّ رسولؐ اور اسلامی شاعر جناب مولانا عبد اللہ مدنی جھنڈا نگری جو کہ خود ایک بہت اچھے نعت گو شاعر ہیں، نعت گوئی کے اصولوں پر اظہار خیال

کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض نامور بلکہ نابغہ روزگار ہستیوں کا کلام جب زیر مطالعہ آیا تو یہ یقین مزید پختہ ہوا کہ جس طرح زندگی کے بیشتر شعبے اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہ پائے اوران کا جو حال ہوا وہی حال شعبہ شعروادب کا بھی ہوا ہے بالخصوص نعتیہ شاعری کا۔غزلیہ شاعری میں فسق کا پہلو نمایاں ہے تو نعتیہ شاعری بڑی حد تک شرک سے آلودہ ہوگئی ہے۔نعت کا معاملہ بہت ہی اہم اور نازک ہے۔ فارسی کے ممتاز شاعر عرفی نے نعت گوئی کے حوالے سے تلوار کی دھار پر قدم رکھ کر ''آہستہ برو'' کہتے ہوئے تنبیہ کی تھی، لازم تھا کہ ہمارا شاعر متنبہ ہوکر کج فکری سے مامون رہتا اور ''با محمدؐ ہوشیار'' کو صفحہ دل پر نقش کر لیتا۔مگر برا ہو مبالغہ آرائی کی للک اور غلو کی بے لگام خواہش کا جو عبد ومعبود کے درمیان روز روشن کی طرح عیاں فرق کو بھی نظر انداز کر کے غیر اللہ سے مرادیں مانگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔لیکن قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم جو بے حد پاکیزہ فکر کے شاعر ہیں اور جن کی نعتیں غلو کی غلاظتوں سے یکسر پاک ہیں۔آپ کے اشعار میں حبِ محمد ﷺ کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے لیکن محبت کی اس جذبات انگیزی میں بھی آپ کا قلم بہکتا نہیں اور آپ عبد اور معبود کے فرق کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں''۔

اسی طرح نعت گوئی کے تقاضوں کا کما حقہ علم رکھنے والے شمس بدایونی کہتے ہیں:

''آنحضور کی عظمت وتقدیس میں اس قدر غلو نہ کیا جائے کہ مقام الوہیت تک بات پہنچ جائے۔ یہ دنیوی عشق ومحبت کے افسانے نہیں جہاں محبّ محبوب کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر کہتا ہے، سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے، یہاں خدا کی خلاقیت وربانیت، قہاری وجباری، حاکمیت اور اس کی بے انتہا عظمت وکبریائی پر یقین کامل کے پیش نظر ہی آنحضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی عبدیت، بشریت اور نبوت کی عظمتوں کو سمجھنا ہوگا۔ بعثت انبیا سے باری تعالیٰ کا مقصد وحدانیت کی تبلیغ تھا اور اپنے احکام کی بندوں تک ترسیل تھی۔ چنانچہ باہمہ عظمت ووقار انبیا ورسل اس کے مبلغ ومرسل تھے۔ لہٰذا الوہیت ونبوت کی حدود کو سمجھنا شعراء کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ نعت کے باب میں ذراسی لغزش بھی سالہا سال کی عبادت وریاضت وزہد وتقویٰ، عمل وجہد کو کالعدم کرکے قعر مذلت میں گرادے گی۔ قطع نظر اس کے کہ یہ لغزش ''افراط'' کی ہو یا ''تفریط'' کی۔ لہٰذا شعراء حضرات نعت کو محض شاعری ہی نہ سمجھیں بلکہ یہ ایک مستحب عبادت بھی ہے اور یہ عبادت یقیناً ان قیود کے ساتھ کی جائے گی جو شریعت محمدیؐ نے متعین کردی ہیں۔ مثلاً نعت کی تکنیک اور طرز اظہار وبیان وغیرہ کا تعین علمائے عروض ہی کریں گے۔ لیکن اس میں جو مضمون نظم کیے جائیں گے ان کی صحت شریعت محمدی طے کرے گی۔ لہٰذا ہر شاعر بطور تبرک نعت کے میدان میں اپنی کج فکری کے گھوڑے نہ دوڑائے، بلکہ وہی اس صنف نظم میں طبع آزمائی کرے جسے دین اسلام کا صحیح فہم ہو اور جو اسلام کی صحیح روح سے آشنا ہو''۔

قرآن حکیم میں بھی غلو سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اے کتاب والو اپنے دین میں غلو مت کرو۔ اسی طرح اللہ کے رسولؐ نے بھی غلو کو بہت معیوب قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح پہلے کے لوگوں نے غلو کرکے اپنے آپ کو تباہ کرلیا تھا۔ آپ ﷺ نے خود کو عبداللہ کا بیٹا، اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ کہلوانے کی تاکید کی ہے۔ لیکن بہت سے شعراء اللہ کے رسولؐ کے اس فرمان کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اس طرح نعت گوئی کرتے ہوئے بھی اپنی عاقبت بگاڑ لیتے ہیں۔

نعت گو شعراء کو اس کا علم ضرور ہونا چاہئے کہ وہ کون سے موضوعات ہیں جن کو نعت میں نظم کیا جاسکتا ہے۔ نعت گوئی میں ان جھوٹے دعووں اور وعدوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے جو عام طور پر غزل میں باندھے جاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو

منظوم کرنے یا آپ سے اظہار عقیدت میں ایسی باتیں منظوم نہیں ہونی چاہئیں جو حقیقت سے پرے ہوں۔ مبالغہ آرائی کی تو بالکل ہی گنجائش نہیں ہے۔ اس سلسلے میں شمس بدایونی نعت کے مشروع موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"نعت کے موضوعات کی دو اہم بنیادیں ہیں۔ ایک وہ جس میں آنحضورؐ کی سوانح و شخصیت اور اس کا حسن آجاتا ہے۔ اس کی حیثیت قطعی انفرادی ہے جنہیں ہم معتقدات کے تحت لیتے ہیں۔ بعض شخصیتیں خود محترم ہوتی ہیں اور وہ معاشرہ میں اس بلند مقام پر متمکن ہوتی ہیں جہاں احترام کی آنکھ اور محبت کی نظر بڑھ کر خود ان کے قدم چومتی ہے۔ اس پہلو سے آنحضورؐ کی شخصیت ایک انفرادی شخصیت ہے۔ جس میں آپ کا نبی ہونا، رسولؐ ہونا، خاتم النبیین ہونا، تمام عالم کے لیے رحمت ہونا، محبوب خدا ہونا، حسب ونسب میں اعلیٰ ہونا، جسمانی حسن میں اپنی مثال آپ ہونا، قول وفعل میں یکساں ہونا، بے پناہ اخلاقی اوصاف حمیدہ سے متصف اور ان میں بے مثال ہونا، غرضیکہ معجزات اور دیگر تمام صفات وکمالات مع ان کمالات واوصاف کے جو آپ کے خصائص میں شمار کیے جاتے ہیں، آپ کی شخصی اور انفرادی خوبیوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان معتقدات کو نعت کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ دوسری بنیاد وہ ہے جس میں آپؐ کے اعمال، افعال اور تعلیمات آتی ہیں۔ انسان اپنے اعمال صالحہ اور بلیغ تعلیمات کے سبب بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ایسی تعلیمات جو ساری کائنات کے لیے قوانین فطرت اور ضوابط زندگی کے طور پر محفوظ کر لی گئی ہوں۔ پھر ایسے اعمال جن کو تمام مخلوق نے اپنے لیے مثالی سمجھا ہو۔ اعمال وافعال میں آپؐ کی مکمل زندگی یعنی طرز معاشرت وعبادت، تجارت ومعاملات، حکومت وجہاد اور افعال قبیحہ سے فطری گریز وغیرہ سب ہی چیزیں آتی ہیں۔ تعلیمات کے ضمن میں وحدانیت کی تبلیغ، رسالت پر ایمان، شعائر اللہ کا احترام، ارکان اسلام کی پابندی،

عقائد اسلام کا ایقان اور زندگی سنوارنے کے لیے اسلامی طرز عمل۔ ان دو بنیادی موضوعات سے ہٹ کر نعت نبیؐ کی تعمیر مکمل نہیں ہو سکتی''۔

نعت گوئی کے رموز و نکات اور ان باریکیوں اور نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اور صنف نعت کی حدود و قیود میں رہ کر رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ حمیدہ اور آپ کی صفاتِ پاکیزہ کی تعریف و توصیف کرنے والوں میں ایک محترم اور مبارک نام ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کا بھی ہے۔ مولانا حامد الانصاری انجم کی شاعرانہ صفات اور فنی صلاحیتوں کا مرکز و محور صرف اور صرف نعت رسولؐ محترم ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ آپ نے دیگر اصناف میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ آپ نے غزل، نظم، مخمس، مسدس، قطعہ، رباعی وغیرہ میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں لیکن ایک عرصے سے آپ نے نعت کہنے اور اسلامی نظمیں لکھنے تک اپنی صلاحیتوں کو محدود کر لیا ہے اور نعت گوئی کو اپنے لیے سرمایۂ نجات تصور کر کے اپنی تمام تر قلمی و شاعرانہ قوتوں کو اسی کے لیے وقف کر دیا ہے۔

راقم الحروف نے ان کی شاعری اور خاص طور پر ان کی نعت گوئی کا بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ میں بچپن سے ہی ان کا کلام پڑھتا اور سنتا آ رہا ہوں اور اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ مولانا حامد الانصاری انجم نے عنفوان شباب کا زمانہ دہلی میں گزارا۔ آپ نے عربی کی تعلیم دہلی کی درسگاہوں اور طب کی تعلیم طبیہ کالج قرول باغ دہلی میں ۱۹۵۹ء میں حاصل کی۔ اوائل عمر ہی سے آپ کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ ابتداء میں آپ نے غزلوں میں بھی طبع آزمائی کی اور نظموں میں بھی۔ محوی لکھنوی کے تلمیذِ عزیز سرشار کسمنڈوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ لیکن جلد ہی طبیعت کی موزونی نے اصلاح سے بے نیاز کر دیا اور انہوں نے دیکھتے دیکھتے پہلے دہلی کے ادبی حلقوں میں اور پھر مشرقی اتر پردیش کی ادبی اور مذہبی محفلوں میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔

۱۹۶۹ء میں آپ کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''چراغِ حرم'' جب منظر عام پر آیا تو اس نے وہ دھوم مچائی کہ بہت جلد پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور چونکہ انتہائی آسان زبان میں وارداتِ قلبی کا اظہار ان نعتوں میں تھا اس لیے اس کی بیشتر نظمیں اور

نعتیں خاص طور پر مدارسِ اسلامیہ کے طلبہ واساتذہ کو زبان زد ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ آپ مذہبی حلقوں میں نعت خواں کی حیثیت سے بلائے جانے لگے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوش گلو بھی بنایا ہے لہٰذا مدارس اسلامیہ کے جلسوں خصوصاً اتر پردیش اور مہاراشٹرا کے جلسوں میں آپ کو بڑے اشتیاق سے مدعو کیا جانے لگا۔ چراغ حرم کے بعد آپ کے کم و بیش ایک درجن نعتیہ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی کئی نثری اور منظوم تصنیفات زیر طبع اور زیر ترتیب ہیں۔ آپ جہاں نعت گو کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں وہیں دنیائے ادب میں بچوں کے اسلامی شاعر کی حیثیت سے بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ بچوں کے ذہن ومزاج کو سامنے رکھ کر آپ نے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔

مولانا حامد الانصاری انجم کی شاعری حب رسول ؐ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ان میں شاعرانہ خوبیاں اور ادب کی جھلکیاں حسن کارانہ انداز میں موجود ہیں۔ وہ وارداتِ قلبی کا اتنے مؤثر اور پُرکیف انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرنے لگتی ہے۔ سلاست وروانی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ نغمگی بھی ان کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ کے اکثر نعتیہ مجموعوں میں حرم اور دیارِ حرم کی تکرار ملتی ہے۔ آپ کی نعتوں کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم خود شہر محمد ﷺ کی گلیوں میں پہنچ گئے ہیں اور ان کی رنگینیوں اور تابناکیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہیں۔ انتہائی سیدھے سادے اور مؤثر انداز میں کہے گئے آپ کے نعتیہ اشعار سیدھے سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ سادگی و پرکاری کا ایسا شاندار امتزاج دوسرے شاعروں کے یہاں بہت کم نظر آتا ہے۔ اکثر جگہوں پر شمع حرم، چراغِ حرم، حرمین، کعبہ شریف، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور سید حرمین کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔

آپ کی نعتیہ شاعری میں دو صفات بہت کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک رسول مکرم و محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وبارک وسلم سے عقیدت و محبت اور دوسرے دیارِ حرم سے وابستگی اور لگاؤ۔ یہ دونوں اوصاف آپ کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں لیکن مجال کیا کہ کہیں تکرار ہو یا الفاظ کا کثرت استعمال ذہن ودماغ پر گراں گزر جائے۔ اگر کہیں تکرار

بھی ہے تو وہ اتنے خوبصورت اور دلفریب انداز میں ہے کہ وہ شاعرانہ خوبی بن گئی ہے۔
رسول اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ کفر اور باطل کے درمیان تصادم بھی نظر آتا ہے اور ظاہر ہے ان پر حبِ رسول اللہ ﷺ غالب آجاتی ہے۔ خیر البشر، خیر الوریٰ، شفیع الامم، ساقیٔ کوثر، مدینے کی گلیاں اور بہارِ مدینہ جیسے الفاظ جگہ جگہ اپنی جلوہ سامانیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

جب آپ حب رسولؐ میں ڈوب کر نعتیہ اشعار کہتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ربّ کائنات نے آپ کے قلم کو نعت گوئی کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں......

آستانِ حبیبِؐ خدا مل گیا
مل گیا خلد کا راستہ مل گیا
احمدِ مصطفٰی کیا ملے ہمنشیں
خالقِ دو جہاں کا پتہ مل گیا

حبیبِؐ خدا یعنی امت کے والی
ادائیں ہیں ان کی نرالی نرالی
ہمیں یاد جس وقت بھی آئی ان کی
تو بے ساختہ ہم نے گردن جھکالی

خلوص و محبت کی ہر بات ہوگی
جب اہل حرم سے ملاقات ہوگی
حرم میں کبھی دن کبھی رات ہوگی
ہمہ وقت ''ان'' سے ملاقات ہوگی
تمنا ہے کہ چھیڑیں آج پھر سرکار کی باتیں

رسولِ ہر دو عالم احمدِؐ مختار کی باتیں

چاند نکلا ستاروں کو شرم آگئی
مسکراتے نظاروں کو شرم آگئی
ضو فشاں جب ہوا ''آفتابِ حرم''
دہر کے جلوہ زاروں کو شرم آگئی

غمِ دوراں غمِ دنیا سے اس کو کیا غرض اے دل
جو طیبہ کا ہے شیدا جو ہے دیوانہ محمدؐ کا
مجھے دیکھا تو یوں اربابِ محفل بول اٹھے انجمؔ
وہ دیکھو جھومتا آتا ہے مستانہ محمدؐ کا

سلاست و روانی اور نغمگی کے ساتھ محبتِ رسول کا مشاہدہ کرنا ہو تو یہ اشعار دیکھیں......

نہ دولت نہ جاہ و حشم چاہتا ہوں
کسی کی نگاہِ کرم چاہتا ہوں
نہ شیریں کا شیدا نہ عذرا کا طالب
میں عشقِ نبیؐ الحرمؐ چاہتا ہوں
وہ میدانِ محشر ہو یا حوضِ کوثر
نگاہِ شفیع الاممؐ چاہتا ہوں
جو رولا کرے نعتِ احمد کے موتی
میں انجمؔ اک ایسا قلم چاہتا ہوں

مولانا حامد الانصاری انجم کی نعتیہ شاعری میں کیف و نغمگی اور حلاوت و شیرینی کا جو حسین امتزاج ہے اس کو کوئی جا کر مدارسِ عربیہ کے طلبہ سے پوچھے۔ ۶۰ کی دہائی سے

لے کر اب تک یعنی نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر گیا لیکن مشرقی یوپی کے گورکھپور، بستی، سدھارتھ نگر، سنت کبیر نگر، گونڈہ اور مئو و بنارس اور ممبئی وغیرہ کے اسلامی اداروں میں آج بھی بیشتر طلبہ آپ کی نعتوں کو گنگناتے اور مذہبی جلسوں میں پڑھتے مل جائیں گے۔ ہندوستان اور نیپال کی سرحد پر واقع سیکڑوں مدارس سے وابستہ اساتذہ اور طلبہ پر اب بھی آپ کی نعت گوئی کا جادو چھایا ہوا ہے۔ مذہبی جلسوں میں ایسے نعت خواں حضرات کی ایک نسل آپ کی نعتوں کی مرہونِ منت ہے جس نے آپ کی نعتیں جلسوں میں ترنم سے سنا سنا کر بے انتہا شہرت حاصل کی ہے۔

سہل ممتنع کے ایسے نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جنھوں نے مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنا گرویدہ بنالیا......

گل تو گل خار مسکرائے ہیں
جب چمن میں حضورؐ آئے ہیں

چاند تاروں کو نیند آئی ہے
جب کبھی آپؐ مسکرائے ہیں

تاقیامت جو بجھ نہیں سکتے
آپؐ نے وہ دیے جلائے ہیں

جانِ احمدؐ کی شان تو دیکھو
گالیاں کھاکے مسکرائے ہیں

آرزوؤں کا کھل اٹھا ہے کنول
جب کبھی آپ یاد آئے ہیں

وہ دیکھو اٹھی ہے گھٹا دھیرے دھیرے
چلی رحمتوں کی ہوا دھیرے دھیرے

بڑھی تیرگی سارے عالم میں جس دم
جلی شمع غارِ حرا دھیرے دھیرے
پکارا نبیؐ نے جو کوہِ صفا پر
تو مکے میں گونجی صدا دھیرے دھیرے
نظر اپنی انجم ہے سوئے مدینہ
زباں پر ہے صلِ علیٰ دھیرے دھیرے

وہ اپنی گلی کی بات کریں
ہم کوئے نبیؐ کی بات کریں
گلشن کے مہکتے پھولوں میں
کچھ آؤ کلی کی بات کریں
ہم شمع حرم کے دیوانے
ہم بزمِ نبی کی بات کریں
غربت میں امیری میں ہمدم
ہر وقت خودی کی بات کریں

آپ جب مدینۃ النبیؐ کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے بھینی بھینی خوشبو بکھر گئی ہو......

مدینے کی گلی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے
وہاں ہر ہر قدم پر زندگی معلوم ہوتی ہے
یہ طیبہ ہے اسے شہرِ نبی کہتی ہے اک دنیا
فرشتوں کی یہاں محفل سجی معلوم ہوتی ہے

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت کو منظوم کرتے

ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان سے نور کی بارش ہورہی ہو۔

بہ دل مسرت بہ لب تبسم فرشتے مژدہ سنا رہے ہیں
خوشا یہ ساعت زہے مقدر حضورؐ تشریف لا رہے ہیں
وہ ظلمتِ شب ہوئی گریزاں وہ صبح صادق ہوئی فروزاں
نکلنے والا ہے شاہِ خاورؐ، ستارے اب جھلملا رہے ہیں
بتوں سے کس نے یہ کہہ دیا ہے کہ آمدِ شاہِ انبیاء ہے
کچھ ایسی طاری ہوئی ہے ہیبت لرز رہے لڑکھڑا رہے ہیں

......اور معراج کا منظر ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں......

سرورِؐ کون و مکاں اپنے مکاں تک پہنچے
فرشِ خاکی سے اُٹھے بامِ جہاں تک پہنچے
کعبہ اور مسجدِ اقصیٰ سے سرِ عرش بریں
اللہ اللہ مرے سرکار کہاں تک پہنچے
کوئی پہنچا ہے نہ پہنچے گا وہاں تک اَے دِل
شبِ معراج کے مہمان جہاں تک پہنچے

مولانا حامد الانصاری انجم کی نعت گوئی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حدود کی پامالی نہیں ہے۔ جو اللہ کا مرتبہ ہے اس میں مداخلت نہیں ہے۔ بہت ہی محتاط انداز میں نعتیں کہی گئی ہیں اور کہیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ اللہ تعالیٰ کے درجے سے ملایا نہیں گیا ہے۔ کہیں بھی شرک کی بو نہیں ہے اور کسی بھی شعر میں رسالت کو الوہیت سے ہم آہنگ نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ داخلی جذبات حفظ مراتب پر حاوی نہ ہونے پائیں اور حبِ رسولؐ میں اتنا غلو نہ ہو جائے کہ احمد کو احد بنا دیا جائے اور سچ بات تو یہ ہے کہ نعت گوئی کی یہ بنیادی خصوصیت ہونی چاہیے۔

ممتاز ادیب اطہر فاروقی نے آپ کی نعت گوئی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''دہلی جیسے بڑے شہروں میں ادب اور شاعری کے نام پر سمینار منعقد کیے جاتے ہیں اور ان میں مرغ و ماہی سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصلی ادب گاؤں میں ہے اور اصلی شاعری دیہات و قصبات میں کی جارہی ہے۔ نعت گوئی میں حامد الانصاری انجم کا مقام بہت بلند ہے لیکن شاید شہروں کی جگمگاتی دنیا سے دور رہنے کے سبب آسمانِ سخن کے اس انجم تاباں پر بہت کم لوگوں کی نظر گئی ہے۔''

حقیقت واقعہ بھی یہی ہے کہ شہرت طلبی کے مزاج سے نا آشنا ہونے اور اخبارات و رسائل میں چھپنے چھپانے کے شوق سے دور رہنے کے سبب آپ کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کے آپ حقدار ہیں۔ آپ شہروں کی بظاہر ریاکارانہ چمک دمک پر دیہات و قصبات کے حقیقی شب و روز کو ترجیح دیتے ہیں۔ شریفانہ مزاج کی وجہ سے آپ کو وہ حربے نہیں آتے جن کو اپنا کر لوگ ایوارڈ و انعام کے قطب مینار پر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ کو نعتیہ شاعری میں اپنے شب و روز گزار دینے میں جو سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے وہ فن کی قیمت وصول کرنے میں نہیں ملتا اور ظاہر ہے، نعتیہ شاعری کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، وہ کسی ایوارڈ یا انعام کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ تو خود ایسا قیمتی سرمایہ اور ایسا لافانی ایوارڈ ہے جس کے آگے دنیا کے تمام ایوارڈ پھیکے اور ان کی چمک دمک ماند ہے۔

آپ کی نعتوں میں حرمین شریف کی جلوہ سامانیاں بکھری نظر آتی ہیں اور مدینے کے دیدار کی تڑپ قارئین کو بھی تڑپاتی رہتی ہے۔ آپ کی نعتوں میں ایسے اشعار کی بھرمار ہے جن میں دیدار مدینہ کی خواہشیں انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں اور شاعر بڑی ہی عقیدت کے ساتھ شہر نبیؐ میں پہنچ جانے کی آرزو کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر ہمیشہ عالم تصورات میں مدینے کی گلیوں ہی میں خرام ناز کرتا رہتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں مدینے کے گلی کوچے اپنی حشر سامانی کے ساتھ موجود رہتے ہیں اور شاعر کے نزدیک وہ گلی کوچے رشک جنت ہیں۔ ایسے بے شمار اشعار ان کی نعتوں میں موجود ہیں جو شہر مدینہ سے شاعر کے جذباتی اور قلبی تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ آستان حبیب خدا اور سبز گنبد کا بھی بار بار ذکر آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کے اپنے تمام تر

شب و روز آستان حبیبِ خدا پر گزار دینا چاہتا ہے اور سبز گنبد کے جلووں کو نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے بسا لینا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں......

سنا اے صبا کچھ مدینے کی باتیں
مدینے کی باتیں ہیں جینے کی باتیں

نہایت حسیں ہیں مدینے کی گلیاں
بہار آفریں ہیں مدینے کی گلیاں
نگاہ مسلماں میں سچ پوچھیے تو
بہشت بریں ہیں مدینے کی گلیاں

یہی دیکھتا ہوں جدھر دیکھتا ہوں
چراغ حرم جلوہ گر دیکھتا ہوں
میں آج اپنی قسمت پہ نازاں ہوں انجم
مدینے میں آقا کا گھر دیکھتا ہوں

عجب دلربا ہے دیار مدینہ
بہار آفریں ہے بہار مدینہ
ہے خلدِ نظر جلوہ زار مدینہ
ہے جنت بداماں دیار مدینہ
بچھا دوں گا پلکوں کو پاسِ ادب سے
نظر آئے گا جب منار مدینہ
تمنا ہے دل کی خدائے دوعالم
دکھا دے ہمیں بھی دیار مدینہ

حریم روضہ خیر الوریٰ کی بات کرتے ہیں
دیار مصطفیٰ اور مصطفیٰ کی بات کرتے ہیں

حاصل ہے مجھے لذت آزار مدینہ
میں روز ازل ہی سے ہوں بیمار مدینہ
ہے دل میں مرے حسرت دیدار مدینہ
اے کاش کبھی دیکھ لوں دربار مدینہ
آتے ہیں خریدار لیے جان کا ہدیہ
کم ہوتی نہیں رونق بازار مدینہ

ہند اچھا ہے مرے دوست نہ شام اچھا ہے
سچ جو پوچھو تو مدینے کا مقام اچھا ہے
جو فروزاں ہے مدینے کے افق پر یارو
جملہ سیاروں سے وہ ماہ تمام اچھا ہے
دیکھتے کیا ہو حقارت سے ہمیں اہل جہاں
بادشاہوں سے محمدؐ کا غلام اچھا ہے

آپ کی نعتوں میں صرف شہر مدینہ ہی کی جلوہ سامانی نہیں ہے بلکہ دوسرے مقامات کی رونقیں بھی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں۔

حرم کی بات کرتے ہیں منیٰ کی بات کرتے ہیں
قبا کی اور پھر اہل قبا کی بات کرتے ہیں
کبھی زم زم کبھی طائف کبھی میزاب رحمت کی
کبھی مروہ کبھی کوہ صفا کی بات کرتے ہیں

جائیں گے ہم بقیع میں جس دم
ہر طرف جاں نثار دیکھیں گے

شاعر عالم تصور میں جب مکہ، مدینہ اور شہر پیمبرؐ کے اطراف میں پہنچتا ہے تو اس پر ایک جذباتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ان مقامات کے حوالے سے اپنی خوش بختی پر نازاں ہونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی قسمت کا ستارہ بام عروج پر ہے. جس کی وجہ سے ان مقامات مقدسہ کے جلوؤں کو اپنی نگاہوں میں بسانے کا اسے شرف حاصل ہو گیا ہے۔ یہ شرف ہی دراصل حاصل زندگی ہے۔ اس نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے دور رہ کر جو ساعتیں گزاری ہیں وہ لاحاصل ہیں اور اصل زندگی کا لطف تو اب آیا ہے جب وہ اپنی نگاہوں سے وہاں کے ذرّوں کو چوم رہا ہے۔ ایک نعت جو کہ ''نعت مسلسل'' ہے شاعر کی دلی کیفیت کو بیان کر رہی ہے اور اس میں مسرت وانبساط کے ساتھ سوز وگداز بھی ہے جو پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس نعت مسلسل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

دیار مصطفیؐ ہے اور میں ہوں
مدینے کی فضا ہے اور میں ہوں
خوشا یہ رفعت چشم تصور
حبیبؐ کبریا ہے اور میں ہوں
کبھی ہے باب کعبہ اور زم زم
کبھی کوہ صفا ہے اور میں ہوں
بسی ہے وادی عرفات دل میں
نگاہوں میں منیٰ ہے اور میں ہوں
جہاں سے روشنی پھیلی جہاں میں
وہی غار حرا ہے اور میں ہوں
تجلی ریز ہیں جس کی فضائیں

وہ دامان قبا ہے اور میں ہوں
مٹے گی اب مٹے گی تشنہ کامی
در زم زم کھلا ہے اور میں ہوں
غلاف کعبہ ہے ہاتھوں میں اپنے
خوشا وقت دعا ہے اور میں ہوں
حریم کعبہ اقدس میں انجمؔ
خداؤں کا خدا ہے اور میں ہوں

ان اشعار کو گنگناتے وقت قارئین بھی ان مقامات مقدس کی سیر کو نکل جاتے ہیں اور انہیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ بھی ان کے دیدار سے شرف یاب ہو رہے ہیں۔

آپ نے بچوں کے لیے اسلامی نظمیں بھی لکھی ہیں جو انتہائی آسان زبان میں اور بہت درد اور تڑپ کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ سادہ الفاظ کے ساتھ ساتھ ان میں نغمگی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر:

یہاں مستقل آب و دانہ نہ سمجھو
ہے دنیا اسے جاودانہ نہ سمجھو
میں مومن ہوں اسلام کا ہوں سپاہی
مری زندگی راہبانہ نہ سمجھو
سرِ دار بھی چڑھ کے ہنستا رہوں گا
اسے جذبۂ شاعرانہ نہ سمجھو

ان اشعار میں تڑپ اور درد و کرب دیکھیے ......

حق ہے رسوا سرِ بازار میں کیسے دیکھوں
مرد مومن بھی ہے بیمار میں کیسے دیکھوں
عصمت مریم و تقدیس خواتین حرم
لٹ رہی ہے سر بازار میں کیسے دیکھوں

ہے ہدف ہند میں تنقید کی تنقیص کی بھی
امتِ سیدؐ ابرار میں کیسے دیکھوں
ہائے وہ شخص جو قاتل ہے ہزاروں سر کا
اس کے ہی سر پہ ہے دستار میں کیسے دیکھوں

وہ عصر حاضر کے انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں......

درگہِ حق میں آکے دیکھ ذرا
اس کو بھی آزما کے دیکھ ذرا
تجھ کو کیا کچھ نہیں ملے گا یہاں
اپنے سر کو جھکا کے دیکھ ذرا
زندگی خوشگوار ہو جائے
غم میں بھی مسکرا کے دیکھ ذرا

اس طرح ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم نعت گوئی کے میدان میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ایسے شعراء بہت کم ملیں گے جنھوں نے اپنی شعری صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کو صرف اور صرف نعت گوئی کے لیے وقف کر رکھا ہو۔ ان کی نعتیہ شاعری کے متعدد پہلو ہیں ہر پہلو انتہائی جاذب اور پُرکشش ہے اور گہرے تجزیے کا متقاضی ہے۔

○○

''چراغِ حرم'' اور ''منارِ حرم'' پر ایک نظر

''چراغ حرم'' اور ''منار حرم'' ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کے دو انتہائی مقبول نعتیہ مجموعے ہیں۔ پہلے چراغ حرم کی اشاعت ہوئی اور اس کے کافی دنوں کے بعد منار حرم جلوہ گر ہوا۔ چراغ حرم کی اپنی ایک تاریخ ہے جو کسی بھی شعری مجموعہ کے لیے اور وہ بھی نعتیہ مجموعہ کے لیے فخر کی بات ہو سکتی ہے۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی شعری مجموعہ کی اور وہ بھی نسبتاً کم معروف شاعر کے مجموعہ کی اتنی پذیرائی ہوئی ہو۔ اردو کتابوں کی اشاعت اور وہ بھی شاعری کی کتابوں کی، خسارے کا سودا ہوتا ہے۔ شاعر یا مصنف اپنا سرمایہ لگاتا ہے اور اپنی کتاب دوست احباب میں مفت تقسیم کرتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایسی کتابیں فروخت بھی ہوتی ہوں۔ صرف ایسے شاعروں اور مصنفوں کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں جن کا یا تو کسی سلسلے سے تعلق ہو یا ان کا کوئی ایسا خاندانی بیک گراونڈ ہو کہ مریدوں اور پیروؤں کی نسل کی نسل موجود ہو۔ کسی ایسے شاعر کے لیے جس کے پاس نہ تو ایسا کوئی سلسلہ ہو اور نہ ہی کسی ادارے کی مضبوط پشت پناہی ہو، اتنی مقبولیت باعث فخر ہوتی ہے۔

چراغ حرم کا اولین ایڈیشن نومبر ۱۹۶۹ میں منظر عام پر آیا اور چند مہینوں کے اندر اس کے دو ہزار نسخے ختم ہو گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے ماحول میں جب کہ دیہی علاقوں کے اردو حلقوں میں تعلیمی بیداری بہت زیادہ نہیں آئی تھی اور نہ ہی لوگوں میں شعری ذوق تھا، دو ہزار نسخے چند مہینوں میں کیسے اور کیونکر ختم ہو گئے۔ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب لوگوں میں سخن فہمی ہو اور ان کا شعری ذوق اتنا ستھرا ہو کہ وہ کوئی اچھا شعری

مجموعہ دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ اردو کتابوں کی اشاعت کی تاریخ میں ابن صفی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے جاسوسی ناول ہاتھوں ہاتھوں ختم ہو جایا کرتے تھے۔ بلکہ ایک ایک ناول کو متعدد افراد یکے بعد دیگرے پڑھا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ یہ بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی ناول بازار میں آتا تو ایک شخص پڑھتا اور درجنوں بیٹھ کر اسے سنتے تھے۔ اس کے بعد شاید کسی اور مصنف کے حصے میں یہ مقبولیت نہیں آئی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ کوئی مذہبی کتاب نہیں تھی بلکہ جاسوسی ناول ہوتا تھا جسے ''ادب میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہے''۔ شعری مجموعوں میں غالباً حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے مذہبی حلقوں میں پڑھا اور سنا جاتا تھا۔ اس کی بھی یہ تاریخ ہے کہ محفلوں میں ایک شخص پڑھتا اور درجنوں اسے سنتے تھے۔ شاہنامۂ اسلام آمد اسلام سے لے کر بعد تک کے واقعات کی ایک منظوم تاریخ ہے جو انتہائی دلنشین پیرایے میں لکھی گئی ہے۔ حفیظ جالندھری ایک عالمی شہرت یافتہ شاعر تھے اور ان کی متعدد غزلیں اور نظمیں بھی کافی مقبول ہوئی ہیں۔ ملکہ پکھراج، طاہرہ سید اور نور جہاں نے ان کی نظم ''ابھی تو میں جوان ہوں'' انتہائی خوبصورت انداز میں گا کر اسے امر بنا دیا ہے۔ لیکن ہر کوئی حفیظ جالندھری نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ہر شاعر اور وہ بھی اسلامی شاعر اتنی مقبولیت حاصل کر سکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کے چراغ حرم کو یہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

چراغ حرم کے پہلے ایڈیشن کے ختم ہو جانے کے بعد اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت جلد نہیں ہو سکی۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے درمیان ایک طویل وقفہ ہے۔ پہلا ۱۹۶۹ میں اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ میں یعنی تقریباً ۳۳ سال کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس درمیان یہ مجموعہ نایاب رہا اور اس کے مطالبے کے باوجود مختلف وجوہ سے وہ جلد شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اس کی نقالی کی جانے لگی اور متعدد شاعروں نے چراغ حرم کے نام سے اپنے نعتیہ مجموعے شائع کیے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی نعتوں اور بحروں کی بھی نقالی کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ تراکیب اور تلازمات کو بھی اپنے اشعار

میں جگہ دی جانے لگی۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ بعض شاعروں نے تو ان کی نعتوں کے عنوانات اور بعض اوقات پورے پورے شعر تک کا سرقہ کرلیا۔ لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود چراغ حرم کی مقبولیت کسی دوسرے مجموعہ کے حصے میں نہیں آئی نہ ہی مولانا انجم کی ایک اسلامی اور نعت گو شاعر کی حیثیت کسی دوسرے شاعر کو حاصل ہوئی۔

یہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ چونکہ مولانا موصوف ایک مذہبی شخصیت ہیں اور ان کا تعلق مدرسوں اور دینی جلسوں سے ہے اس لیے ان کے مجموعہ کو یہ مقبولیت دینی مدارس کے طلبہ اور مذہبی جلسوں سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں تھی۔ دوسری بات یہ کہ آپ کا حلقہ مشرقی اتر پردیش کے اضلاع رہے ہیں اس لیے ان باتوں کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ اگر کوئی مذکورہ حقائق کو عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں دیکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کو مایوسی ہوگی۔ کیونکہ مولانا انجم کا تعلق نہ تو عصری جامعات اور کالجوں سے رہا ہے اور نہ ہی لیکچرر اور پروفیسر حضرات سے رہا ہے۔ لہذا اسے بالکل دینی اور مذہبی ماحول میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال اگر ہم چراغ حرم کی مقبولیت کے اسباب کا جائزہ لیں تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ چراغ حرم کی نعتیں اس وقت کی روایتی نعت گوئی کے ماحول میں بہار کے کسی تازہ اور خوشگوار جھونکے کی مانند تھیں۔ ان کو پڑھ کر ایسا لگتا جیسے ہم کسی نئے ماحول میں آگئے ہیں۔ اشعار میں داخلی جذبات کی انفرادیت، تراکیب کی نزاکت، الفاظ کا دروبست اور اللہ کے رسولؐ اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ساتھ قلبی اور جذباتی لگاؤ کا اظہار قارئین کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتا۔ چراغ حرم کی نعتوں کی خصوصیات پر آگے چل کر اظہار خیال کیا جائے گا۔ مقبولیت کی دوسری وجہ خود مولانا کی شخصیت تھی۔ اللہ نے انہیں غضب کا ترنم دیا تھا۔ اس وقت تک وہ دینی جلسوں میں بحیثیت اسلامی شاعر اور بحیثیت نعت گو مدعو کیے جانے لگے تھے۔ وہ ان جلسوں میں اپنی ہی نعت ترنم سے پڑھتے تھے اور جب پڑھتے تو مجمع ایک عجیب وغریب کیفیت سے دوچار ہو جاتا۔ ان کی آواز کا جادو سوتے ہوؤں کو بھی جھٹکے سے بیدار کر دیتا۔

سامعین پر ایک وجد طاری ہو جاتا اور وہ نعت کے اشعار کے سحر میں گرفتار ہو جاتے اور جھومنے لگتے۔ ان کے انداز نے بھی چراغ حرم کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ جب بھی وہ کوئی نعت پڑھ کر اسٹیج سے نیچے اترتے تو لوگ فوراً ان سے دریافت کرتے کہ یہ کس کی نعت ہے اور کہاں سے ملے گی۔ جب ان کو پتہ چلتا کہ یہ تو چراغ حرم کی نعت ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتے۔ لوگوں کے اشتیاق کو دیکھ کر انجم صاحب نے ''چراغ حرم'' کی اشاعت کا فیصلہ کیا اور پھر یوں بھی ہوا کہ جب لوگوں کا تقاضا بڑھنے لگا تو چراغ حرم کے کچھ نسخے جلسوں میں لے جائے جانے لگے۔ یہ کام وہ کسی دوسرے شخص کے سپرد کر دیتے جو جلسوں میں رعایتاً اسے فروخت کرتا۔ چراغ حرم کی مقبولیت کو دیکھ کر بہت سے ایسے نعت خواں حضرات پیدا ہو گئے جو صرف اور صرف آپ ہی کے انداز میں لکھتے ہیں۔ ایسے نعت خواں بھی پیدا ہوئے جو دینی جلسوں میں صرف آپ کی نعت پڑھتے اور آپ ہی کے انداز میں پڑھتے ہیں۔

اس مجموعہ کی مقبولیت کی ایک وجہ اور تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت جبکہ رنگین ٹائٹل کی چھپائی بہت کم ہوتی تھی چراغ حرم کا ٹائٹل رنگین چھاپا گیا تھا۔ وہ اتنا دیدہ زیب اور سحر انگیز تھا کہ اس پر نظر پڑ جاتی تو ہٹتی نہیں تھی۔ گنبد خضری کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اسی کے اوپر ایک چراغ بنایا گیا تھا جس کی لو سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس طرح کے ٹائٹل اس وقت تک دیہی علاقے کے لوگوں نے دیکھے نہیں تھے اس لیے انہیں وہ بہت پسند آیا تھا۔ آج بھی جبکہ اس میدان میں زبردست انقلاب آیا ہوا ہے، اگر اسی انداز کا ٹائٹل چھاپا جائے تو یقیناً لوگ اسے بے حد پسند کریں گے۔ ایک اور بات کا ذکر کر دینا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دینی درسگاہوں میں اس وقت کوئی ایسا نعتیہ مجموعہ نہیں تھا جس میں عقائد کی درستگی کے ساتھ اور نعت گوئی کے تمام تر لوازمات اور شرائط کے ساتھ اشعار کہے گئے ہوں۔ یا تو ایسے نعتیہ مجموعے پائے جاتے تھے جن میں افراط و تفریط سے کام لیا جاتا اور عبد اور معبود کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا یا پھر لکیر کے فقیر کی مانند روایتی انداز کی شاعری پڑھنے کو ملتی تھی۔ ایسی شاعری جس میں نہ تو کوئی نیا پن ہوتا اور نہ ہی کوئی

انفرادیت۔ ایسے ماحول میں چراغ حرم نے نعت گوئی کی پوری فضا ہی بدل کر رکھ دی۔ یہ مجموعہ نعت کے میدان میں ایک گراں قدر عطیہ تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے چراغ حرم ایک بوجھل اور روایتی فضا میں بہار کا ایک خوش گوار اور تازہ جھونکا تھا جس نے باذوق قارئین کو ایک نئے ماحول میں پہنچا دیا۔ ان میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ ''چراغ حرم'' کو آپ نے شاعر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نام منسوب کیا ہے۔ انتساب کی خوب صورت زبان ملاحظہ کریں......

''میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ اور متاع بے مایہ کو شاعر بارگاہ رسولؐ، مداح پیمبر صحابیٔ رسولؐ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نام نامی واسم گرامی کے ساتھ منسوب ومعنون کرتا ہوں جن کی ستودہ صفات ایک اسلامی شاعر کے لیے مشعل راہ اور سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ جن کی مقدس ومطہر شاعری کو زبان وحی ترجمان سے ''ایّدک اللہُ بروح القُدُس'' کا طرۂ امتیاز وتمغۂ سرفراز حاصل ہو چکا ہے۔''

اس مجموعے میں آپ کے استاد محترم جناب مولانا لطافت علی ہما صدیقی کراچی کا پیش لفظ اور مولانا ذکر اللہ صاحب ذاکر ندوی کا تبصرہ وتعارف شامل ہے۔ ہما صاحب آپ کی نعت گوئی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں......

''ان کی نعت گوئی کا معیار اعلیٰ اور غلو سے مبرا ہے، وہ محبت سے لبریز ہوتے ہوئے بھی شریعت کے حدود وقیود سے تجاوز نہیں کرتے۔ نعت گوئی کا حق صرف انہی شعرا کو ہے جو مزاج دین سے بھی آشنا ہوں اور مذاق فکر سلیم سے بھی بہرہ ور ہوں۔ ایسے ہی ہوش مند شعرا میں سے ایک ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم بھی ہیں۔ فہم وعقیدت کی اس مشکل وادی سے وہ ماشاء اللہ بڑی سلامت روی کے ساتھ گزرے ہیں۔ انہوں نے جملہ اصناف شاعری میں سے صرف نعت سرور کائنات کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔ بڑی کامیابی اور بے حد دلکشی کے ساتھ حدود شرعیہ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے نعت ہی میں سب کچھ کہہ

دیا ہے۔ پڑھیے اور سعادت حاصل کیجیے''۔

جبکہ ستھرا شعری ذوق رکھنے والے ادیب اور سخن فہم استاد مولانا عبد الحفیظ رحمانی آپ کی نعتوں کو غلو سے پاک اور سچی وارفتگی کی آئینہ دار بتاتے ہوئے لکھتے ہیں......

''نعت گوئی دیگر اصناف سخن کے مقابلے کتنی مشکل ہے اس کا اندازہ تو فن کے اسرار ورموز جاننے والے ہی کر سکتے ہیں مگر اتنا تو سب ہی سوچ سکتے ہیں کہ ایک طرف فکر سخن اور دوسری طرف ایسے الفاظ کا انتخاب جو ادب واحترام کا بہترین تصور سامنے لاتے ہوئے بھی حدود بشریت سے متجاوز نہ ہوں اور مقام الوہیت ومقام عبدیت کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے عظمت رسول کو اشعار میں پیش کرنا یقیناً مشکل ہے۔ لیکن انجم صاحب نے اس وادی کو بھی جس فنی چابکدستی اور سبک روی سے طے کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ان کی نعتوں میں نہ غلو ہے نہ اوچھی منقبت، بلکہ وہ سچی محبت اور وارفتگی کی آئینہ دار ہیں۔ انجم صاحب کی نعتوں کا دوسرا قابل تعریف پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیشتر نعتوں میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے تابناک واقعات وحالات کی طرف واضح اشارات کیے ہیں۔ اس لیے نعت ومنقبت کی افادیت وتاثیر میں اضافہ ہو گیا ہے۔

آغاز میں (انجم صاحب نے) تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی مگر قسمت انہیں مقدس موضوع نعت کا شاعر اور بارگاہ رسالت کا خصوصی ترجمان بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسی صنف سخن پر اپنی تمام تر توجہ منعطف کردی اور اب وہ ایک بہترین کامیاب اور نغمہ بار نعت گو بن چکے ہیں۔ انجم صاحب کے نعتیہ کلام میں شاعرانہ خوبیاں اور ادب کی جھلکیاں حسن کارانہ انداز سے موجود ہیں۔ روانی، سلاست اور فصاحت کے ساتھ ساتھ نغمگی جو ان کی سخن آرائی کی اصل خصوصیت ہے ہر نظم میں جلوہ گر ہے۔ حرم اور دبستان طیبہ کے معروف ومشہور نغمہ زن زائر حرم حمید صدیقی کا والہانہ انداز

انجم صاحب کے کلام میں جا بجا نمایاں ہے۔ بعض نظمیں تو رنگ حمید میں اس طرح ڈوبی ہیں کہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ زائر حرم کی ہیں۔ حالانکہ وہ سرتاسر انجم صاحب کی ہیں اور یہ بہترین کمال کا مظاہرہ ہے۔ انجم صاحب نے اپنے انتخاب کا نام سید حرم اور اپنے نام کی رعایت کرتے ہوئے ''چراغ حرم'' رکھا ہے جو بڑا اچھا ہوا اور نہایت مناسب نام ہے۔ چراغِ حرم میں ہر جگہ حرمین، کعبہ شریف، مدینہ طیبہ اور سید حرمین کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں اور سب کی عکاسی شاعرانہ آداب سے کی گئی ہے۔ نعت میں غلو کا مظاہرہ ہر دور میں اکثر شعراء سے ہوتا رہا ہے مگر چراغِ حرم اس مبالغہ آرائی سے پاک ہے اور ''با محمدؐ ہوشیار'' کا حق ادا کر رہا ہے۔ کتاب اشاعت پذیر ہو کر اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ اسے تمام و کمال زیر مطالعہ لا کر خود اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ سرسری جائزہ کے طور پر اس کے چند اشعار پیش ہیں جس سے چراغ حرم کے مقام کا ہلکا سا اندازہ ہو جائے گا۔ ایک ہی بحر و قافیہ میں حمد و نعت دونوں ہیں، مگر مضمون کے فرق کے ساتھ تنوع کا بہترین رنگ ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے حمد کے نعت دیکھیں:

خدائے دوعالم شہنشاہ عالی
تری ذات یکتا انوکھی نرالی
ہیں ارض وسما تیری رحمت سے قائم
تو ہے گلستان دوعالم کا مالی
غریبوں کے داتا فقیروں کے آقا
ادھر بھی نظر ہو کہ دامن ہے خالی
تجھے خوب معلوم ہے تیرا انجم
نہ ہوگا کسی اور در پہ سوالی

اب اسی بحر اور زمین میں نعت کے اشعار ملاحظہ فرمائیں......

حبیبؐ خدا یعنی امت کے والی
ادائیں ہیں ان کی نرالی نرالی
ہمیں یاد جس وقت بھی آئی ان کی
تو بے ساختہ ہم نے گردن جھکا لی
کہیں بھی ملا ان کا ہمسر نہ ثانی
مورخ نے دنیا بہت دیکھی بھالی
بہت سے ہوئے نعت گو پھر بھی انجم
نہ گزرا کوئی مثل اقبالؔ و حالیؔ

آپ کی نعتوں کی ایک بہت بڑی خوبی نغمگی اور روانی ہے۔ آپ پڑھتے چلے جایئے کہیں بھی آپ کو الجھاؤ یا رکاوٹ نہیں ملے گی۔ زبان کی شیرینی اور پر کیف منظر کشی بھی اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کے یوم ولادت کو جشن میلاد کے نام سے منایا جاتا ہے۔ لیکن آپؐ کی ولادت با سعادت کو اتنے دلکش اور خوبصورت انداز میں شاید ہی کسی نے نظم کیا ہو۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ عنوان ہے خیر مقدم……

بہ دل مسرت بہ لب تبسم فرشتے مژدہ سنا رہے ہیں
خوشا یہ ساعت زہے مقدر حضورؐ تشریف لا رہے ہیں
وہ ظلمت شب ہوئی گریزاں وہ صبح صادق ہوئی فروزاں
نکلنے والا ہے شاہ خاور ستارے اب جھلملا رہے ہیں
بدل رہی ہے چمن کی قسمت ہے دیدنی ہر روش کی صورت
بہار نو کی ہے آمد آمد کہ پھول سب مسکرا رہے ہیں
بڑھی ہے دونوں جہاں کی رونق جو آرہے ہیں رسولؐ برحق
مگر شیاطیں کو دیکھیے تو کھڑے کھڑے تلملا رہے ہیں
بتوں سے کس نے یہ کہہ دیا ہے کہ آمد شاہ انبیا ہے
کچھ ایسی طاری ہوئی ہے ہیبت لرز رہے لڑکھڑا رہے ہیں

گناہگارو ہراس کیسا یہ فکر کیسی ملال کیسا
قسیم کوثر، شفیع محشر ادھر تو دیکھو وہ آرہے ہیں

آپ کی شاعری میں جو غنائیت ہے اور جو جدت کے ساتھ ساتھ روایت بھی ہے، اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معروف ادیب اطہر فاروقی کہتے ہیں......

''چراغِ حرم'' کی زبان شاعر کے بلند ذوق ہی کا نہیں کلاسکیت سے واقفیت اور نکات شعر کی تمام تر پابندی کی بھی غماز ہے ___ انجم صاحب نے اپنی قادرالکلامی سے رواں دواں بحروں میں پوری احتیاط کے ساتھ (جو نعت کی اولین شرط ہے) لفظوں کا تخلیقی استعمال، مسلمہ تلازمات کے ساتھ انہیں اجنبی بنائے بغیریوں کیا ہے کہ جی چاہنے لگا کہ میں ایسی شاعری کیوں نہیں کرتا یا کرسکتا ___ انجم صاحب نے اشعار میں جذبے کی وہ تاثیر سمودی ہے کہ اشعار پڑھتے ہی اور اس نام کے زبان ولب پر آتے ہی دل میں تازہ گلاب تو اترنے ہی لگتے ہیں انجم صاحب کے اشعار سے یہ کیفیت دوبالا ہوجاتی ہے اور ہم خود کو کائنات کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔''

چراغ حرم کی نعتوں میں مترادفات کا بھی خوب استعمال ہوا ہے اور اس خوبی کے ساتھ ہوا ہے کہ کہیں بھی نہ تو کلام کی غنائیت پر اثر پڑتا ہے اور نہ ہی الفاظ کی تکرار بری لگتی ہے۔ درود وسلام کے عنوان سے ایک نعت کے چند بند ملاحظہ فرمائیں......

تمہارے دم سے حضورؐ انور ہوئی ہے بزم جہاں منور
مہک اٹھی ہے فضائے عالم چمک اٹھے ہیں یہ ماہ واختر
خدا کی رحمت مدام تم پر درود تم پر سلام تم پر

طبیب ملت، حکیم امت، امین وصادق، رؤف ورحمت
سراج خلوت، ضیائے جلوت، سحاب رحمت، بہار جنت
خدا کی رحمت مدام تم پر درود تم پر سلام تم پر

ریاض دیں کی شمیم تم ہو، بہار نو کی نسیم تم ہو
کلیم تم ہو، حلیم تم ہو، رحیم تم ہو، کریم تم ہو
خدا کی رحمت مدام تم پر درود تم پر سلام تم پر
حبیبؐ پروردگار عالم، یہ کہہ رہا ہے تمہارا انجم
بصد عقیدت، بصد محبت، بہ لب تبسم، بہ ہر ترنم
خدا کی رحمت مدام تم پر درود تم پر سلام تم پر

اس مجموعہ کی نعتوں میں غزل کے رنگ بھی پائے جاتے ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ کہیں بھی شان رسالت میں گستاخی نہیں ہوتی۔ انہوں نے غزلوں کے انداز میں نعت لکھ کر ایک نئی طرح ڈالی ہے جس کی پیروی دوسرے شعرانے بھی کی ہے۔

گل تو گل خار مسکرائے ہیں
جب چمن میں حضورؐ آئے ہیں
چاند تاروں کو نیند آئی ہے
جب کبھی آپ مسکرائے ہیں
آرزوؤں کا کھل اٹھا ہے کنول
جب کبھی آپ یاد آئے ہیں

آپ نے اپنی نعتوں میں اپنے دلی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ جن سے رسولؐ اکرم سے شاعر کے والہانہ لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ واردات قلبی کو انہوں نے اس خوبی کے ساتھ اشعار کا جامہ پہنایا ہے کہ انہیں بار بار گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ عشق رسولؐ آپ کے دل میں کس درجہ گھر کر چکا ہے اوران کی خواہش آپ کے آستانے پر حاضری دینے کی کس درجہ ہے اس کا اندازہ بھی ان کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب شاعر خود اس سرزمین پر نہیں پہنچ پاتا اور دوسرے لوگ جاتے ہیں تو ان سے بہت ہی والہانہ اور عاجزانہ انداز میں اپنا سلام پیش کرنے کو کہتا ہے۔ وہ عازم مدینہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں......

محبوب کبریا سے میرا سلام کہنا
محمود و مجتبیٰ سے میرا سلام کہنا
طیبہ میں مصطفیٰ سے میرا سلام کہنا
جب سامنے پہنچنا میرا سلام کہنا
اے عازم مدینہ میرا سلام کہنا

میرا سلام کہنا سلطان دوسرا سے
میرا سلام کہنا سردار انبیا سے
میرا سلام کہنا امت کے پیشوا سے
اتنا تو یاد رکھنا میرا سلام کہنا
اے عازم مدینہ میرا سلام کہنا

اپنا بھی غم سمو کر انجم کی التجا میں
بطحا کی سرزمیں پر اور دلنشیں فضا میں
محبوب کبریا سے دربار مصطفیٰؐ میں
جس وقت تم پہنچنا میرا سلام کہنا
اے عازم مدینہ میرا سلام کہنا

رسولؐ اللہ کے حضور سلام کا نذرانہ صرف شاعر ہی نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ اس کائنات کی ہر چیز پیش کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ خود اللہ تعالیٰ بھی آپ کے حضور میں سلام کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ ''نذر عقیدت'' کے عنوان سے یہ مخمس انتہائی پر اثر اور سحر انگیز ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں......

غریق قلزم عرفاں سلام کہتا ہے
فدائے ملت و ایماں سلام کہتا ہے
ہر ایک عامل قرآں سلام کہتا ہے
بصد خلوص مسلماں سلام کہتا ہے

بطرز نو بصد عنواں سلام کہتا ہے
تری وہ ذات کہ رحمت سلام کہتی ہے
ملائکہ کی عقیدت سلام کہتی ہے
بصد نیاز محبت سلام کہتی ہے
تری وہ شان کہ رحماں سلام کہتا ہے
بطرز نو بصد عنواں سلام کہتا ہے
نجوم و شمس و قمر بھی سلام کہتے ہیں
ملک بھی اور بشر بھی سلام کہتے ہیں
شجر تو خیر حجر بھی سلام کہتے ہیں
چمن میں رنگ بہاراں سلام کہتا ہے
بطرز نو بصد عنواں سلام کہتا ہے

اس طرح یہ پوری نظم ایک ایسا تائژ پیدا کرتی ہے جو قاری کو رسولؐ اکرم کے آستانے پر عالم تصور میں پہنچا دیتا ہے۔ اس مجموعہ میں جتنی بھی نظمیں ہیں سبھی اظہار خیال کی دعوت دیتی ہیں لیکن دشواری یہ ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو دوسرے مجموعوں کا حق مارا جائے گا اور مولانا انجم صاحب کی پوری نعتیہ شاعری پر گفتگو نہیں ہو پائے گی۔

چراغ حرم کی مانند منارحرم کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی لیکن بہر حال اس کے حصے میں وہ شہرت نہیں آئی جو اول الذکر کے حصے میں آئی۔ اول الذکر نے مولانا انجم صاحب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ نعتیہ مجموعے کے ساتھ آپ کی شہرت اور مقبولیت کو بھی چار چاند لگ گئے تھے۔ بہر حال منارحرم بھی کم مقبول نہیں ہوا۔ دونوں مجموعے اگرچہ ایک جیسے لگتے ہیں لیکن دونوں میں بہت فرق ہے۔ جذبات واحساسات کا جو طوفان اول الذکر مجموعہ میں ہے وہی ثانی الذکر میں بھی پایا جاتا ہے لیکن انداز جداگانہ ہے۔ اس میں دوسرے نعت گو شعرا کے کلام کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ آپ کی نعت گوئی کا فن اب بھی جوان ہے اور اس پر زوال نہیں آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ

نے استاد اور کلاسیکی شعرا کا مطالعہ بھی خوب کیا ہے۔ ہند و پاک کے مشہور و معروف ادیب ونقاد اور شاعر، بے شمار کتابوں کے مصنف و مولف مولانا ماہر القادری نے ایک ''سلام'' لکھا ہے جس پر نقادان فن کا کہنا ہے کہ ماؔہر القادری کے سلام کے بعد کوئی اور سلام نہ نظر کو بھاتا ہے نہ دل کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی زمین میں ایک سلام منار حرم میں بھی موجود ہے اور اس کی تاثیر بھی کم نہیں ہے۔ اس میں کل ۱۲۳ اشعار ہیں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں......

سلام اُس پر کہ جو کونین میں اشرف ہے امجد ہے
سلام اُس پر کہ جس کا نام احمدؐ اور محمدؐ ہے
سلام اُس پر محبت جس نبی کی عین ایماں ہے
سلام اُس ذات پر جس پر نزول نصِ قرآں ہے
سلام اُس پر کہ جو تھا سرور دیں رحمت عالم
مساوات و اخوت کا جو تھا پیغمبر اعظم
سلام اُس پر جسے حاصل امیری تھی فقیری میں
سلام اُس پر جسے معراج تھی روشن ضمیری میں
سلام اُس پر جو عبداللہ کی اولاد بہتر ہے
سلام اُس پر جو بطن آمنہ کا لعل و گوہر ہے
سلام اُس پر حلیمہ سعدیہ نے جس کو پالا تھا
سلام اُس پر جسے کُل قوم نے گھر سے نکالا تھا
وطن والے جسے آرام سے رہنے نہ دیتے تھے
سلام اُس پر جسے حق بات بھی کہنے نہ دیتے تھے
سلام اُس ذات اقدس پر شریعت لے کے جو آیا
سلام اُس پر جہاں میں دین برحق جس نے پھیلایا
سلام صد ہزاراں گنبد خضریٰ کے ساکن پر
سلام اُس جسم اطہر پر سلام اس پاک باطن پر

سلام اُس پر جو ہے شاہ امم خیر البشر انجمؔ
سلام اُس پر سلامی دیں جسے شمس و قمر انجمؔ

چراغ حرم کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ میں منظر عام پر آیا تھا اور منار حرم کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ میں سامنے آیا۔ اس کے بعد یہ مجموعہ بھی دینی مدارس میں طلبہ اور اساتذہ اور دینی جلسوں میں نعت خواں حضرات کے لیے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوا۔

منار حرم میں ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کی ردیف میں ایک نعت ہے جس کو پڑھ کر مشہور شاعر اقبال سہیلؔ کی نعت یاد آ جاتی ہے۔ اس زمین میں بہتیرے شعراء نے طبع آزمائی کی کوشش کی ہے مگر آپ نے اس زمین کی نہ صرف خوشہ چینی کی بلکہ اس میں اپنی طبیعت، ذوق و مزاج اور شاعرانہ اپج کا بڑی چابک دستی سے رنگ بھر کر اس زمین کو اپنا بنالیا ہے۔ اس نعت کے چند اشعار اس طرح ہیں......

ذات مکرّم، خُلقِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم
شان گرامی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
سرور دیں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم
ماہ منور ، نیر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
جن پہ فدا ہے سارا زمانہ، ہر اک صفت میں جو ہیں یگانہ
وہ ہیں سیدِ وُلدِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
ان کا رتبہ حد سے سوا ہے، ان سا کوئی ہوگا نہ ہوا ہے
ان پہ نازاں بزم دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس مجموعہ میں کئی سلام ہیں جو الگ الگ بحور اور اوزان میں کہے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں نہ تو خیالات کی تکرار ہے اور نہ ہی عدم اثر انگیزی۔ تمام سلام پر تاثیر ہیں اور بار بار دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ مجموعہ منظر عام پر آیا تھا اس وقت مشرقی اتر پردیش کے شعرا میں علاقائی یا مقامی زبانوں میں جو کہ عام بول چال کی زبان ہوا کرتی تھی، نعت گوئی کا چلن تھا۔ جناب حامد الانصاری انجم نے بھی اس

رنگ میں نعت کہی ہے۔ ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس کا عنوان ہے ''رحمت کی بدریا''......

جگ میں آئے جب عربی سنوریا
چھائی رحمت کی کاری بدریا
مشک سے بڑھ کے ہے ان کی خوشبو
مہکی مہکی ہے طیبہ نگریا
خلد میں جانے کی ہے تمنا
چھوڑو ہرگز نہ ان کی سنگھریا
اس کے دونوں جہاں بن گئے ہیں
پڑ گئی جس پہ ان کی نجریا
اک وہی کام آئیں گے اس دم
حشر کی جب لگے گی بجریا
میں انہی کا ہوں مداح انجم
دوش پہ جن کے کالی چدریا

جناب ایمن المدنی منارِ حرم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا انجم صاحب نے اپنے جذبہ محبت کو مخصوص تہذیبی قدروں اور نصب العین کی جہتوں سے بڑا ہی پاکیزہ اور مثالی مشاہدات، تاثرات، احساسات اور جذبات کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ پورے مجموعہ کو الفت رسولؐ کے بحر نا پیدا کنار میں ڈوب کر لکھا ہے اور وہ اس میں بڑی کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ ''منارِ حرم'' میں جو صدا بلند ہوئی ہے وہ دل کے سازوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی ہے۔ آپ کی نعتوں میں مزاج کی لطافت اور طبیعت کی شگفتگی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت خوش آہنگی، زبان و بیان کی ندرت، لہجے کی سادگی اور بحروں کی

نغمگی ہے۔ لفظوں کا انتخاب، زمینوں کی تلاش اور ردیف وقافیہ کی طرفگی عیاں بیاں ہے۔ میں نے جب منارِ حرم کا مطالعہ کیا تو اس کی نعتوں سے وجدانی کیفیت پیدا ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ ایمن المدینی بھی انجم صاحب کے ساتھ انہی کیفیات سے دوچار ہے جن سے مجبور ہو کر ایک محبِّ رسولؐ نے ان نعتوں کی تخلیق کی ہے"۔

منارِ حرم کے بھی دو ایڈیشن شائع ہوئے اور اب وہ بھی چراغ حرم کی مانند نایاب ہو چکا ہے۔ ان دونوں مجموعوں کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی اتر پردیش کے مختلف علاقوں میں نعت گو شعرا نے ان کی نعتوں کی نقالی کی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پیروی کی ہے۔ یہ دونوں مجموعے بلاشبہ نعتیہ مجموعوں کی تاریخ میں نمایاں اور قیمتی سرمایہ ہیں۔

○○

محبِ رسولؐ اور مدّاحِ اَصحابؓ

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم ایک محبّ عاشق رسولؐ ہیں۔ آپ کی زندگی اور آپ کی شاعری دونوں اس کے گواہ ہیں۔ آپ نے اپنے شب وروز کے معمولات میں ان سرگرمیوں کو داخل نہیں ہونے دیا جو عقیدت رسولؐ کے تقاضوں کے منافی ہوں اور ان سے الگ راستہ اختیار کریں۔ وہ لوگ بڑے مبارک اور مکرم ہیں جو آپ ﷺ کی سنت کو اپنی زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ سچائی ہے کہ جو عاشق رسولؐ ہوگا وہ مداح اصحابؓ بھی ہوگا۔ اصحابؓ پیمبر نے اسلام کو پوری دنیا میں پہنچانے کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کی کہیں پر بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ جاں نثاران محمد ﷺ ہی تھے جنھوں نے اپنی زندگیوں کی پروا نہیں کی اور آپ کی ایک آواز پر صحراؤں اور سمندروں کا سینہ چاک کر دیا۔

وہ آپ کے مبارک ساتھی ہی تھے جنھوں نے کفر وشرک کی گھنگھور تاریکی میں اسلام کی شمع کو روشن کرنے اور روشن رکھنے کے لیے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ اپنے جسموں کا سارا لہو نچوڑ کر شمع اسلام کو تابندہ رکھنے اور رسولؐ محترم کے ایک ایک اشارے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے نہ صرف تیار رہتے تھے بلکہ اس میں ان کو فخر محسوس ہوتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد وہ آپؐ کے اصحابؓ ہی تھے جنھوں نے آلام ومصائب کی کبھی پروا نہیں کی اور جنھوں نے دنیاوی لذتوں کو ہمیشہ اپنی ٹھوکروں میں رکھا۔ جو زندہ رہتے تھے تو اس لیے کہ اسلام زندہ رہے اور شہید ہوتے تھے تو اس لیے کہ اسلام پر کوئی حرف نہ آئے۔ اسی لیے اللہ کے رسولؐ بھی ان سے بہت محبت

رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے ساتھیوں کو برا بھلا مت کہو۔ ان کو گالیاں مت دو۔ ان کی قربانیوں کے سبب ہی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا کیونکہ وہ خود اللہ سے راضی ہو گئے تھے۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے کسی بھی حکم کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کو وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے لیکن اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے کسی بھی حکم سے سرتابی ہو جائے۔ اس لیے اصحاب رسولؐ کا درجہ بھی بہت بلند اور بہت عظیم المرتبت ہے۔ جو ان کو برا بھلا کہتا ہے سمجھو رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم چونکہ ایک نعت گو شاعر ہیں اور اللہ کے رسولؐ سے عقیدت رکھتے ہیں اسی لیے وہ مداح صحابہؓ بھی ہیں اور جہاں وہ پیغمبر اسلام کی شان میں نعت لکھتے ہیں وہیں انھوں نے اصحابِؓ پیمبر کی شان میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ آپ نے مدحت اصحاب کو نظم کر کے ان کو اپنی جانب سے خراج عقیدت و خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے چند نظمیں ہی نہیں لکھی ہیں بلکہ ''مدح صحابہ'' کے نام سے ایک منظوم مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں کل بارہ نظمیں ہیں اور متعدد قطعات ہیں۔ اس مجموعہ کا انتساب آپ نے اصحابؓ پیمبر ہی کے نام کیا ہے۔ ''نذرانہ عقیدت'' کے عنوان سے اس انتساب میں آپ لکھتے ہیں......

''ملت اسلامیہ وامت مسلمہ یعنی ''خیر امت'' کا وہ مقدس ترین حلقہ جسے اللہ جلّ جلالہ نے اس کے حسن کردار اور پاکیزہ اشغال و اعمال سے خوش ہو کر عرش بریں سے ''رضی اللہ عنھم و رضوعنہ'' کے دلکش و دلربا لقب سے ملقب فرما کر اس کے مقام و مرتبہ علیا کا اعلان بالجہر فرمایا ہے اور جسے رسولؐ رحمت، نبی مکرم، سید الاولین والآخرین، خاتم المرسلین، امام النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفاداریوں، فداکاریوں اور جاں نثاریوں کو دیکھ کر مسرت و شادمانی کے جذبے سے سرشار ہو کر خلوص و محبت کے جھرمٹ میں فرمایا ''لاتسبوا اصحابی'' یعنی اے لوگو میرے اصحاب کرام کو برا نہ کہو اور انہیں

گالیاں نہ دو، جن کی حیات مستعار کا لمحہ لمحہ اسلام کے نام پر وقف ہے، جو ہردم و ہمہ دم ہماری محفل پاک کی زینت بنے رہتے ہیں۔ میں انھی پاکیزہ اصحابؓ کے نام سے اس کتاب کو معنون کرتا ہوں۔ ان کے نام یہ میرے خلوص کا حسین تحفہ ہے۔

مرے صحابہ کو گالی نہ دو خدا کے لیے
انھیں برا نہ کبھی تم کہو خدا کے لیے

''مدح صحابہ'' اصحابؓ کرام کی شان میں عقیدت کے سمندر میں ڈوب کر لکھی گئی نظموں کا ایک حسین اور خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس کی نظمیں بھی انتہائی سادہ اور آسان زبان میں ہیں تاکہ ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجائیں اور وہ اس بات کو محسوس کریں کہ اللہ کے رسولؐ اپنے ساتھیوں سے کتنی محبت رکھتے تھے اور وہ بھی اللہ کے رسولؐ کے ایک ایک اشارے پر کس طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ چونکہ آپ کے ساتھیوں کا لقب ''رضی اللہ ورضوعنہم'' ہے اس لیے حامد الانصاری انجم نے اس مجموعہ کی پہلی نظم میں اسی کو موضوع بنایا ہے۔ پانچ بند کی یہ نظم بے حد اثر انگیز ہے اور آپؐ کے ساتھیوں کا سراپا بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے۔

خندۂ گل ہے ان کا تبسم
نغمۂ دلکش ان کا ترنم
قطرۂ شبنم ان کا تکلم
بحرِ ہدایت کے ہیں تلاطم
محفل ان کی محفل انجم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم
داور محشر ان کا حامی
ان پہ فدا ہیں عالم و عامی
ان کی ہستی نامی گرامی

مدح کناں ہیں سعدیؔ و جامیؔ
ان پہ فدا ہیں ماہ و انجم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم
ان پہ خدا کا خاص کرم ہے
سرورِؐ دیں کا لطف اتم ہے
زیرِ نگیں گلزار ارم ہے
ان پہ نازاں لوح و قلم ہے
آؤ کہیں پھر مل کر ہم تم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اللہ کے رسولؐ کی وہ حدیث بہت مشہور و معروف ہے جس میں انھوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ میرے ساتھیوں کو برا بھلا نہ کہو۔ انجم صاحب نے دوسری نظم میں اسی حدیث کو مصرعہ طرح کے طور پر استعمال کیا ہے اور صحابہ کرامؓ سے اپنے جذباتی لگاؤ کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نظم میں بہت ہی کم اشعار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح آپؐ کے ساتھی آپؐ پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے اور کس طرح انھوں نے پوری دنیا میں پرچم اسلام کو بلند کرنے کے لیے قربانیاں دیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔

زمانہ بھر میں نہ تھا ان سے کوئی بھی بہتر
خدا کے بندوں میں وہ لوگ سب سے تھے بڑھ کر
وہ نیک خو تھے اور امن و اماں کے تھے پیکر
زمانہ ان کو نجیب و شریف کہتا تھا
نبیؐ امی کے اطوار کے تھے وہ خوگر
رسولؐ پاک نے اس واسطے یہ فرمایا
مرے صحابہ کو گالی نہ دو خدا کے لیے
انہیں برا نہ کبھی تم کہو خدا کے لیے

......آخری بند ملاحظہ فرمائیں......

خدا کے نام سے سولی پہ چڑھ گئے ہنس کر
مقابلہ کیا دشمن کا خوب بڑھ چڑھ کر
پچھاڑ ڈالے ہیں میداں میں کتنے ہی لشکر
وہ شیر دل تھے بہادر تھے اور تھے جاں باز
رسولؐ پاک نے اس واسطے یہ فرمایا
مرے صحابہ کو گالی نہ دو خدا کے لیے
انہیں برا نہ کبھی تم کہو خدا کے لیے

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے صحابہؓ کرام کا طبقہ ایسا پاکیزہ طبقہ ہے جن سے اللہ راضی ہو گیا ہے اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ اب ایسے پاکیزہ نفوس کی شان میں گستاخی وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں نہ تو خشیت الٰہی ہو اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے کوئی محبت ہو۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے اپنے جن ساتھیوں کو اپنے دلوں سے لگائے رکھا انہی کو ہم برا بھلا کہیں، ان پر طنز و تشنیع کے تیر چھوڑیں اور ان کو اپنے نازیبا کلمات کا نشانہ بنائیں۔ حامد الانصاری انجم کو آپ ﷺ کے ساتھیوں سے بہت لگاؤ ہے اور انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان کی ذات جہت ہی مکرم اور محترم ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ایک نظم میں ان سے اللہ کے راضی ہو جانے کو منظوم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں......

جنھوں نے دکھایا ہے ایماں کا جوہر
جو علم و عمل کے تھے بے شبہ پیکر
مکرتے نہ تھے جو کبھی بات کہہ کر
بھروسہ تھا جن کا ہمیشہ خدا پر
وہ اصحاب احمدؐ تھے اللہ اکبر
خدا ان سے راضی وہ راضی خدا سے

آپؐ کے انہی ساتھیوں نے پوری دنیا میں اسلام کا پرچم بلند کیا اور وہ جس جگہ بھی

گئے صرف اسی لیے گئے کہ وہاں اسلام کا جھنڈا بلند کریں اور شمع اسلام کی لو کو اور تیز کریں۔ انھوں نے اس کے لیے دنیا جہان کی اذیتیں برداشت کیں اور دنیا جہان کے مصائب جھیلے۔ لیکن نہ تو موسم کی سختیاں ان کا راستہ روک پانے کی اہل تھیں اور نہ ہی مخالفین زمانہ سے ان کو کوئی ڈر اور خوف تھا۔ وہ انتہائی بے باک اور نڈر تھے۔ اسی لیے جہاں بھی گئے کھل کر اسلام کی تبلیغ کی اور لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ اس نظم کے ایک بند میں اسی جانب اشارہ ہے......

جہاں بھی گئے دین لیتے گئے جو
رہ حق میں ہر سمت چلتے گئے جو
مصائب کی بھٹی میں تپتے گئے جو
گل ولالہ کی طرح کھلتے گئے جو
وہ اصحابؓ احمد تھے اللہ اکبر
خدا ان سے راضی وہ راضی خدا سے

آج ہم دنیاوی لذتوں میں اس قدر لت پت ہو گئے ہیں کہ ہمیں اس کا کوئی احساس نہیں کہ ہمیں دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں موت سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے۔ لیکن رسولؐ اللہ کے ان جاں نثاروں اور ساتھیوں کو کسی چیز کا خوف نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اللہ سے ڈرتے تھے صرف اسی سے خوف کھاتے تھے۔ اسی لیے ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں تا کہ اسلام کا پرچم سرنگوں نہ ہونے پائے اور وہ پورے عالم میں اپنا جلوہ بکھیرتا رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی عبادت میں بھی مصروف رہتے تھے۔ جہاد کے دوران نماز کے وقت کچھ لوگ نماز ادا کرتے تھے تو کچھ جنگ میں مصروف رہا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ لڑائی کے دوران نماز کا وقت آجاتا تھا تو ان کو اپنی جان جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔ وہ نماز کے لیے صف بستہ ہو جاتے تھے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر دو عالم کی بھلائی کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے......

خدا کی عبادت میں ہر آن تھے جو
نبیؐ کی محبت پہ قربان تھے جو
جہادوں میں اسلام کی شان تھے جو
شہادت کی خاطر پریشان تھے جو
وہ اصحابؓ احمد تھے اللہ اکبر
خدا ان سے راضی وہ راضی خدا سے

علامہ اقبال نے اپنی معرکہ آرا نظم شکوہ میں کہا تھا کہ ہم نے نہ تو جنگلوں اور صحراؤں کو چھوڑا اور نہ ہی دریاؤں اور پہاڑوں سے ہمیں خوف آیا۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں انجم انصاری کہتے ہیں......

سمندر میں دوڑائے ہیں کتنے گھوڑے
جو لڑ جاتے تھے سب سے، تھے گرچہ تھوڑے
بھگاتے تھے سب کو، نہیں تھے بھگوڑے
لگائے جنھوں نے زمینوں کو کوڑے
وہ اصحاب احمد تھے اللہ اکبر
خدا ان سے راضی وہ راضی خدا سے

اس بند میں زمینوں کو کوڑے لگانے کی ترکیب خوب ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے ''ہم مدح صحابہؓ کرتے ہیں''۔ اس میں بڑی نغمگی اور غنائیت ہے۔ چھوٹی سی بحر میں یہ ایک خوبصورت نظم ہے اور اس کو پڑھنے سے دل پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ کریں......

آقاؤں کے درباروں میں
کہساروں میں گلزاروں میں
دوکانوں میں بازاروں میں
متوالوں میں غمخواروں میں

ہم مدح صحابہؓ کرتے ہیں

زرداروں میں ناداروں میں
دریا کے مچلتے دھاروں میں
تلواروں کی جھنکاروں میں
تکبیر کے دلکش نعروں میں
ہم مدح صحابہؓ کرتے ہیں

اگر اصحابِؓ پیمبرؐ نے آپ کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو شاید اسلام کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہو پاتا جو حاصل ہوا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ساتھ نہ دیتے۔ اللہ نے انھیں اسلام کے فروغ کے لیے چن لیا تھا اور انھوں نے بھی خود کو اسلام کی ترویج کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آج انہی کے دم سے دنیا میں اسلام کا بول بالا ہے اور مسلمانوں کی تعداد بے حساب ہے اور وہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ انجم صاحب کی زبان میں اس کی وجہ یہ ہے کہ:

بہر سو روشنی ہے ہر طرف جلوے ہی جلوے ہیں
جلائی مشعل ایماں محمدؐ کے صحابہؓ نے

گلزار نبوت میں گل ہے کہیں لالہ ہے
اصحاب رسالت کا ہر پھول نرالا ہے
اصحابِؓ محمدؐ کی کیا شان بتاؤں میں
ہر بات میں جذبہ ہے ہر عزم ہمالا ہے
یاران مدینہ کی تعریف ہو کیا انجم
ہے نام بڑا ان کا اور کام نرالا ہے

یہ طبقہ ان عالی مرتبت نفوس پر مشتمل ہے جن کی تعریف کرنا آج کے انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کے مرتبے کو تو اللہ جانتا ہے یا پھر رسولؐ اللہ جانتے تھے......

صحابہؓ ہیں کیا کوئی کیا جانتا ہے
جو ہے ان کا رتبہ خدا جانتا ہے
ہمارے صحابہؓ نبیؐ کے دلارے
انہیں صرف ربّ العلا جانتا ہے
بڑے کام ان کے بڑی ان کی باتیں
مدارج کو ان کے خدا جانتا ہے

مدح صحابہؓ کا موضوع بہت وسیع بھی ہے اور بہت طولانی بھی۔ اصحابِ رسولؐ کی شان میں نظم گوئی آسان نہیں۔ کیونکہ ان کا مرتبہ اللہ کے رسولؐ کے بعد آتا ہے اور ان کی شان میں مدحیہ اشعار لکھتے وقت ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا ہوگا کہ کہیں ان کا مرتبہ اللہ کے رسولؐ کے برابر نہ ہو جائے۔ اسی لیے انجم صاحب نے بہت ہی بچ بچا کر نظمیں کہی ہیں اور اپنے قلم کے شہسوار کو ہمیشہ چابک لگاتے رہے ہیں تاکہ وہ حدود اصحابؓ سے باہر نہ چلا جائے اور حدود نبوت میں نہ داخل ہو جائے۔ اس مجموعے میں بے شمار قطعات بھی ہیں جن میں صحابہ کرام کی تعریف کی گئی ہے۔ چند قطعات بطور نمونہ پیش ہیں......

جتنے صحابہؓ آئے جہاں میں
ان کا شہرہ کون و مکاں میں
بعد نبیؐ ہے ان کا درجہ
ان پر سب ہیں دل سے قرباں

ان سے بہتر کوئی نہیں ہے
ان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے
کہنے کو دنیا میں بہت ہیں
ان سے برتر کوئی نہیں ہے

بہت خوب تر ہیں ہمارے صحابہؓ
بڑے دیدہ ور ہیں ہمارے صحابہؓ
زمانے نے دیکھا نہیں ان کا ثانی
بڑے معتبر ہیں ہمارے صحابہؓ

فدا ہو گئے ذات والا پہ جو
کوئی ان سا بہتر و برتر نہیں
عمرؓ آستانے پہ حاضر ہوئے
ابو جہل کا یہ مقدر نہیں

غرضیکہ یہ مجموعہ بہت لاجواب ہے اور اس میں جو نظمیں ہیں وہ اصحاب محمدﷺ سے شاعر کے قلبی اور جذباتی لگاؤ کا ثبوت ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں ایمان کی جو چاشنی ہے اس نے ان کی عقیدت مندانہ شاعری میں ایک نکھار پیدا کر دیا ہے۔ ان کے یہاں اللہ کی محبت، رسولؐ اللہ کی محبت اور اصحابِ رسولؐ کی محبت کا سرچشمہ عقیدت اور ایمان کے بحر بیکراں سے پھوٹ رہا ہے۔ یہی قلبی لگاؤ اور جذباتی وابستگی نعتوں اور حمدوں میں بھی نظر آتی ہے۔

○○

حمدیہ شاعری کا جائزہ

عام طور پر مذہبی شاعری کرنے والے شعرا کے یہاں بھی حمدیہ نظموں کی بڑی قلت ہوتی ہے۔ غزلیہ شاعری کرنے والوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ تاہم تقریباً ہر شاعر حمد اور نعت بھی لکھتا ہے خواہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔ نعت گوئی کے مقابلے میں حمد گوئی قدرے آسان ہے۔ البتہ اس کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ شاعر اللہ جلّ جلالہٗ کی شان کا ادراک رکھتا ہو۔ ادھر کچھ برسوں میں حمد گوئی کا رجحان بڑھا ہے اور حمدیہ مجموعے بھی شائع ہونے لگے ہیں۔ خاص کر پاکستان میں یہ رجحان تیز ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے اپنے ایک مقالے میں اس تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے......

''ادھر چند برسوں میں شاعری میں مذہبی رجحان خوب پروان چڑھا ہے۔ نتیجتاً سیکڑوں نعتیہ مجموعے اور دسیوں حمدیہ شہ پارے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ عرفی نے جسے ''رہ تیغ دودم'' سے تعبیر کیا تھا اور ''با محمدؐ ہوشیار'' کے بالمقابل ''با خدا دیوانہ باش'' کو زیادہ سہل جانا گیا تھا، پھر بھی یہ امر واقعہ ہے کہ حمدیہ شاعری میں شعراء پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ حقیقت حال اس ذات الٰہ کی توصیف بیانی میں شاعرانہ عجز وفہم کی درماندگی کا پتہ دیتی ہے۔ صداقت اس میں بھی ہے کہ معبود کے ساتھ رشتہ عبدیت میں دیوانگی اعلیٰ محبت اور والہانہ عشق کی معراج متصور کی جاتی ہے لیکن اس دیوانگی میں بھی بندے کا اپنے معبود کی تعریف وتوصیف بیان نہ کرسکنا، اللہ کے جلال وجبروت کے آگے خود سپردگی اور اس ذات خداوندی کے حسن وجمال کے آگے اپنی حیرانی اور

تحیر کی دلیل ہے کہ رعب خداوندی سے بندہ عاجز متحیر ومبہوت ہو جاتا ہے اور لب کشائی کی ہمت وجرأت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حمد کے ایک مضمون کو سو طرح سے باندھنے کے روشن امکانات اور شاعرانہ صلاحیت رکھنے کے باوجود شعراء حمدیہ شاعری میں دم نہیں مار سکے"۔

یہ حقیقت بیانی اپنی جگہ پر لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ حمد گوئی سے شاید ہی کوئی شاعر بچا ہو۔ اگر کسی نے حمدیہ مجموعہ شائع نہ بھی کیا تو بھی اس کے کلام میں حمدیہ اشعار مختلف انداز سے مل جائیں گے۔ ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کے زیر تربیت ان کے بڑے صاحب زادے جناب حماد انجم ایڈووکیٹ نے ۱۹۸۱ میں "بہار حمد" کے نام سے حمدیہ مجموعہ شائع کیا تھا۔ خود انجم صاحب نے بھی بڑی تعداد میں حمدیں لکھی ہیں جو جلد ہی شائع ہونے والی ان کی کلیات میں شامل کی جا رہی ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعوں چراغ حرم، منار حرم، نغمہ زار انجم، تاجدار حرم، سرود طیبہ، نعت کے پھول اور اسلامی ترانے میں متعدد حمدیں موجود ہیں، جبکہ حمدوں کا ایک جیبی مجموعہ "لاہوتی نغمے" جو کہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے، شائع ہو چکا ہے۔ چراغ حرم میں ایک حمد شامل ہے جس میں دعائیہ اشعار بھی ہیں۔ اس حمد میں توحید پر خاصا زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ صرف اللہ کی ہی ذات ہے جو دنیا کی خالق ہے اور وہ یکتا اور انوکھی ہے......

خدائے دو عالم شہنشاہ عالی
تری ذات یکتا انوکھی نرالی
ہیں ارض وسما تیری رحمت سے قائم
تو ہے گلستان دو عالم کا مالی

یہاں دنیا کو ایک باغ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اللہ کی ذات کو اس کا مالی بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایک مالی کو اپنے باغیچے سے بڑی محبت ہوتی ہے اور وہ اس کو سجاتا اور سنوارتا ہے اور اس کی آرائش وزیبائش کر کے خوش ہوتا ہے، اسی طرح اللہ نے بھی اس دنیا کو بنایا اور سجایا سنوارا ہے۔ اس حمد میں بڑے ہی سوز وگداز کے ساتھ مخالفانہ ہواؤں پر کرب و بے چینی کا اظہار کیا گیا ہے اور اللہ سے دعا کی گئی ہے کہ وہ غلط

کاروں کو سزا دے اور ایسے افراد پیدا کرے جو ان کی سازشوں کو ناکام بنا دیں:

مسلماں میں خوابیدہ روح عمل ہے
جگا دے عطا کر کے ذوق بلالی
یہ بت سب ستم گر ہیں بار الہا
تو ہی ہے تو ہی ہم غریبوں کا والی
ہے مصروف پیکار پھر حق سے باطل
عطا کر ہمیں طاقت گوشمالی
بتوں نے بہت سر اٹھایا ہے یارب
دکھا دے ذرا اپنی شان جلالی
ضرورت ہے ربّ جہاں اس جہاں میں
کوئی پھر ہو پیدا عمرؓ سا جلالی

قرآن مجید میں آیا ہے کہ اللہ کی تعریف کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ''کہہ دیجئے کہ میرے رب کی باتیں سمندر کا پانی روشنائی کی جگہ ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے۔ اگر چہ اس سمندر کی مثل دوسرا سمندر مدد کے لیے ہم لے آئیں''۔ یہ ارشاد سورہ کہف میں ہے۔ اسی طرح سورہ لقمان میں بھی کہا گیا ہے کہ ''اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر اور ہو جائیں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی''۔ حامد الانصاری انجم نے اپنے کئی اشعار میں اس مضمون کو باندھا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں بہت ہی آسان اور سیدھے سادے انداز میں یہی بات کہی گئی ہے......

کوئی کیونکر کرے تیری حمد وثنا
جبکہ عاجز رہے انبیا اولیا

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی اللہ کا ذکر کرے، اگر چہ وہ اس سلسلے میں عاجز ہے، تو دنیا کے مصائب و آلام سے اسے نجات مل جائے گی اور اسے مسرتوں اور

شادمانیوں کا خزانہ میسر آجائے گا......

تیرا ذکر مبارک ہے مشکل کشا
ہے ترا اسم ذاتی غموں کی دوا
اے خدا اے خدا اے خدا

آپ کی حمدوں میں دعائیہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے آپ کے دل کی گہرائیوں میں خشیت الٰہی موجزن ہے۔ ان دعائیہ اشعار میں جہاں نظام جہاں کی خرابیوں کو دور کرنے کی شدید خواہش ہے وہیں خود بھی اللہ کی رضا حاصل ہونے کی تمنا بھی ہے۔ اس شعر کو ملاحظہ کریں......

بخش دے بخش دے میرے جرم وخطا
گو نہیں میرے عصیاں کی کچھ انتہا
کاش حاصل ہو انجم کو تیری رضا
ہے تمنا یہی اور یہی ہے دعا
اے خدا اے خدا اے خدا

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان خطاؤں کا پتلا ہے اور قیامت کے روز اگر اس کی بخشش ہوگی تو اللہ کی رحمت سے ہی ہوگی۔ کوئی کتنا ہی عبادت گزار اور پرہیز گار کیوں نہ ہو جائے اس کی نیکیاں اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ وہی چاہے گا تو بندے کی بخشش ہوگی ورنہ جہنم کا ایندھن انسانوں اور پتھروں کو ہی بنایا جائے گا۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں......

نہیں ناز کچھ اپنے حسن عمل پر
فقط اس کی رحمت کا ہی آسرا ہے

اور پھر نوک قلم پر دعا مچلنے لگتی ہے:

خطا بخش دے اپنے انجم کی یارب
یہی التجا ہے یہی مدعا ہے

اللہ رب العزت کی کرم فرمائیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا دریائے رحمت بے کراں ہے اور جب اس میں جوش پیدا ہوتا ہے تو معمولی سی بات بھی بخشش کا بہانہ بن جاتی ہے۔ جنت اور جہنم اس کے عفو و درگزر اور غیظ و غضب کی نشانیاں ہیں۔ اس بات کو کس خوبصورت انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے......

ترے کرم کی کوئی حد ہے اور نہ کوئی حساب
تجھی کو لوگ غفور الرحیم کہتے ہیں
ترے ہی غیظ و غضب کا وہ ایک شعلہ ہے
قسم ہے ہم جسے نار جحیم کہتے ہیں
تری خوشی کے مظاہر ہیں اے خدائے قدیر
جسے بہشت و دارالنعیم کہتے ہیں

اس طرح ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کے یہاں بہت توانا حمدیہ شاعری موجود ہے۔ یہاں چند حمدوں کی روشنی میں اظہار خیال کیا گیا ہے ورنہ آپ کی حمدوں کی تعداد بے حساب ہے۔

آپ نے اپنے حمدیہ اشعار میں عالمانہ رنگ اختیار نہیں کیا ہے، جیسا کہ آپ کی نعتوں میں بھی ہے۔ جس طرح نعتیں بہت ہی آسان اور سلیس زبان میں ہیں اسی طرح حمدیہ اشعار بھی سیدھے سادے انداز میں کہے گئے ہیں۔ ان اشعار میں آورد کا دور دور پتا نہیں ہے، بس آمد ہی آمد ہے۔ نہ تو ان میں مصنوعی تجربات ہیں اور نہ ہی فنکارانہ موشگافیاں ہیں۔ ہاں دلی کیفیات و جذبات کا برملا اظہار ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کی شدید خواہش ہے۔ اپنے گناہوں پر ندامت و شرمندگی ہے اور اللہ سے معافی کی طلب گاری ہے۔ اس کی رحمتوں کا بیان ہے اور انسانی لغزشوں پر اشک آوری ہے۔ غرضیکہ ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کی حمدوں میں اللہ کی ذات سے والہانہ لگاؤ کا اظہار ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہے۔

OO

''وقت کی پکار''
منظر، پس منظر اور پیش منظر

''وقت کی پکار'' ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی ایک پر جوش اور ولولہ انگیز نظم ہے۔ یہ تیس بند پر مشتمل ہے اور اس میں ملک کے نوجوانوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ انہیں خواب غفلت سے بیدار ہونے اور میدان عمل میں سرگرم ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اسی طرح سوتے رہے تو ان کی زندگی رائیگاں چلی جائے گی اور انہیں جس کام کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ پورا نہیں ہوگا۔ نوجوانوں کو عزم و ہمت کے ساتھ اور کمر کس کر میدان زیست کے نشیب و فراز کو عبور کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے للکارا گیا ہے۔ یہ یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انہیں زندگی اس لیے نہیں ملی ہے کہ وہ اسے کھیل کود میں گزار دیں یا بے مقصد ختم کر دیں بلکہ ان کی زندگی کا ایک نصب العین ہے اور انہیں اس کو کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ نوجوانوں کو حرکت و عمل کے لیے مہمیز لگاتے ہوئے ان کو ان کے فرائض کی یاد دہانی کرائی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کی کوئی شے بیکار نہیں ہے اور نہ ہی انجماد کی شکار ہے۔ بلکہ ہر چیز حرکت و عمل میں مصروف ہے اور اپنے مقصد کی جانب گامزن ہے۔

ڈاکٹر حامد الانصاری انجم اس نظم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''وقت کی پکار میری ایک طویل، قدیم اور مشہور و معروف نظم ہے جسے بار بار

دینی جلسوں میں پڑھا اور سنا گیا ہے۔ اسے ۱۹۶۱ میں اس وقت کے بستی ضلع میں واقع نوگڑھ میں منعقدہ عظیم المرتبت اور مہتم بالشان اور بے مثال و بے نظیر اجلاس عام میں پڑھا گیا تھا جسے عوام و خواص نے بے حد پسند کیا تھا۔ بہتوں کے سینے میں آج بھی یہ نظم تازہ ہے۔ اس طویل نظم کا پس منظر صرف اتنا ہے کہ امت مسلمہ کی دینی بے حسی اور ملت اسلامیہ کی ملی سہل انگاری نے جو اپنی آخری حد کو پہنچی ہوئی ہے میرے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کیا اور میرے ذہن و خیال کو اس قدر جھنجوڑا کہ بے ساختہ میرے جذبات نے لوح دماغ سے صفحہ قرطاس پر زبان قلم سے اپنی شکستہ پائی کے نقوش بکھیر دیے اور عوام و خواص سے داد و تحسین کا خراج حاصل کیا۔ میں نے امت مسلمہ کی بے حسی اور نوجوانوں کی ملی پژمردگی پر بہت غور و فکر کیا تھا اور اس بات نے مجھے بے تحاشہ رنجیدہ کر دیا تھا۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ میں مسلم نوجوانوں کے نام ایک ایسی نظم لکھوں جوان کے اندر ایمان و عمل کی حرارت پیدا کر دے، جو ان کے دلوں کو جوش عمل سے لبریز کر دے، جوان کے لہو کو اس قدر گرما دے کہ وہ اپنی ہستی اور حیثیت کو پہچان لیں اور خلاق دو عالم نے جو فریضہ ان کے ذمہ کیا ہے اس کا وہ احساس کریں اور اس فریضے کی ادائیگی کے لیے کمر کس کر میدان میں اتر پڑیں۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں ایک ایک مصرعے میں قوت ایمانی کی ایسی حرارت ڈال دوں جوان کی سرد مہری کی برف کو پگھلا کر اسے آتش فشاں کے لاوے میں تبدیل کر دے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ میری اس نظم سے کوئی غلط پیغام نہ جائے اور نوجوانوں کا طبقہ اس قدر جوش میں بھی نہ آجائے کہ وہ حق اور ناحق کی تمیز بھلا دے اور اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو روند کر نکلتا چلا جائے۔ میں یہ تو چاہتا تھا کہ نوجوانوں کا قافلہ ایک طوفان بلاخیز بن جائے لیکن ایسا طوفان بلاخیز بھی نہیں جو باطل قوتوں کو شکست فاش سے دوچار کرنے کے بجائے سچائی اور حق

گوئی کی طاقت کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ میں یہ احتیاط برتنا چاہتا تھا کہ میری نظم نوجوانوں کو غلط راستے پر نہ ڈالے۔ ان میں تخریبی قوت نہ پیدا کرے۔ ان میں منفی سوچ نہ اجاگر کرے۔ بلکہ میں ان میں تعمیری پہلو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں جو تبدیلی آئے وہ تعمیری انداز میں آئے اور ان کی حرکت اور ان کا عمل معاشرے میں ایک مثبت اور تعمیری سوچ کا نقیب بن جائے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مسلم نوجوان اسلام کے نام پر غیر اسلامی حرکتوں میں ملوث ہوں اور اپنے کردار و عمل سے اسلام اور مسلمان دونوں کو بدنام کر دیں۔ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر الفاظ و تراکیب کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے اپنی نظم میں آگ تو بھر دی ہے لیکن یہ ایسی آگ ہے جو زمانے میں روشنی کر کے ناانصافی کی تاریکیوں کو ختم کرے گی۔ یہ روشنی نہ صرف مسلم نوجوانوں کے دلوں میں اجالا پیدا کرے گی بلکہ دہر میں بھی سچائی کی طاقت کو روشن کرے گی۔"

ان کا یہ دعویٰ بالکل سچا ہے۔ اگر ہم اس نظم کو مجموعی طور پر پڑھیں اور اس کے پیغام کو ذہن میں رکھیں تو پائیں گے کہ ڈاکٹر انجم انصاری نے بہت ہی مشاقی کے ساتھ اپنے افکار و خیالات کو منظوم کیا ہے اور کہیں بھی ایسا موڑ نہیں آنے دیا ہے جو تخریبی رجحان پیدا کرے یا منفی سوچ کی پرورش کرے۔ مثال کے طور پر ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں......

تمہارا ولولہ جواں تمہارا عزم نوجواں
تمہاری ہے زمین بھی تمہارا ہے یہ آسماں
تمہی ہو نائب خدا تمہارا ہے یہ کل جہاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے مسکرانے سے زمانہ مسکرائے گا
جو شمع تم جلاؤ گے جہاں بھی جگمگائے گا
تمہی جو جاگ جاؤ گے تو کون سونے پائے گا
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہی کو ڈھونڈتے ہیں اب اندھیرے بھی اجالے بھی
تمہاری جستجو میں مسجدیں بھی ہیں شوالے بھی
تمہاری ہی تلاش میں ہیں ذرے بھی ہمالے بھی
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

اس نظم میں متعدد خوبیاں ہیں۔ اس میں زبردست جوش وولولہ ہے، شیرینی ہے، نغمگی ہے، موسیقیت ہے اور لہو کو گرمانے والی وہ حدت اور شدت ہے جو میدان عمل میں بے دریغ کود پڑنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مخمس کے پیرائے میں ہے اور بند ان دو مصرعوں پر آکر ختم ہوتا ہے کہ:

بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

یہ نظم ۱۹۶۱ میں لکھی گئی تھی اور اس کی شان نزول مشرقی اتر پردیش کے اس وقت کے ضلع بستی کے شہر نوگڑھ میں اسی سال ہونے والی ایک کل ہند اہل حدیث کانفرنس ہے۔ اس کانفرنس میں اس وقت کے سعودی سفیر برائے ہند جناب یوسف الفوزان بھی شریک ہوئے تھے اور یہ تیس بند کی پوری نظم ڈاکٹر حامد الانصاری انجم نے جو کہ اس وقت عنفوان شباب میں تھے، اپنی مترنم آواز میں پیش کی تھی۔ اس نظم نے اس وقت کانفرنس میں موجود ایک لاکھ شرکاء میں زبردست گرم جوشی پیدا کردی تھی اور اس نے پورے مجمع

کو ایک ولولہ انگیز کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔شرکائے کانفرنس تو متاثر ہوئے ہی تھے سعودی سفیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اس نظم کی ستائش میں چند کلمات بھی ادا کیے تھے۔اس کے بعد تو یہ ایک مضبوط روایت بن گئی کہ جہاں بھی اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ہوتا وہاں ڈاکٹر انجم انصاری کو بلایا جاتا اور ان سے یہ نظم سنی جاتی۔

ڈاکٹر شمس کمال انجم اپنی کتاب ''نقوش جاوداں'' میں اس نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے حافظ عبدالحلیم کوٹوی کے حوالے سے لکھتے ہیں......

''اس کانفرنس میں ملک کے طول وعرض سے علمائے کرام اور عوام کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ایک اندازے کے مطابق اس میں اس وقت کم از کم ایک لاکھ مسلمانوں نے نماز جمعہ ادا کی تھی۔ایک جم غفیر تھا جو سیلاب کی مانند اُمنڈ آیا تھا۔جیسے حج کا منظر تھا جو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔حافظ عبد الحلیم کوٹوی نے جمعیت اہل حدیث کے آرگن جریدہ ترجمان کے خصوصی شمارے میں اس نظم کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا اور بہت ہی درد وکرب کے ساتھ کہا تھا کہ اگر اس نظم کی روشنی میں ملک کے نوجوان آگے قدم بڑھائیں تو ملک میں ایک پرامن اور خوشگوار فضا پیدا ہوسکتی ہے اور نوجوانوں میں حرکت وعمل کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ان کے الفاظ میں ''بعد نماز عشاء اجلاس میں ایک نوجوان شاعر مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم نے ''وقت کی پکار'' کے نام سے ایک نظم سنائی۔جلسے میں فضیلت مآب جناب یوسف الفوزان صاحب سفیر سعودی عرب برائے ہند بھی رونق افروز تھے۔جس وقت یہ نظم پڑھی جارہی تھی میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ نوجوان شاعر نظم سنا کر بیٹھے تو حضرت مولانا عبدالوہاب آروی نے ادب سے نظم مانگی تو میں نے بھی مشتاقانہ آپ سے نظم کی درخواست کی۔آپ نے فرمایا یہ نظم تو اخبار ترجمان میں یکم نومبر کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے____ آپ فرمائیں گے کہ ایسی کون سی بات ہے جس پر تم آنسو بہا

رہے ہو۔ میں عرض کروں گا کہ اس میں عملی قدم بڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔اس عمل کو میری آنکھیں رو رہی ہیں۔'' ____ جن لوگوں کے دل اس کانفرنس کی یاد سے روشن ہوں گے اور اس نظم کے تاثرات برقرار ہوں گے وہ حافظ عبدالحلیم صاحب کی تحریر کی تصدیق تو کریں گے ہی مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ نظم درد اور کرب، تڑپ اور کسک، جوش اور جذبہ، ملت اسلامیہ کے لیے خلوص اور محبت، قوم کو بیدار کرنے اور خواب غفلت سے جگانے کی آرزو سے معمور ہے۔ نظم کے شیریں الفاظ، اس میں پائی جانے والی موسیقیت اور نغمگی، بند کا تسلسل، جذبے کی شدت اور حرارت، قاری وسامع کو اپنے وجدان میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ طوفان بلاخیز میں اسے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی تحریک عطا کرتے ہیں۔ جانب منزل رواں دواں ہونے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔''

نظم کی شروعات خواب غفلت سے بیدار ہونے اور سستی و کاہلی کو خیر باد کہنے کی ترغیب سے ہوتی ہے اور نوجوانوں کے اندر مسرت وشادمانی کی تحریک پیدا کرتے ہوئے ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انہیں مہمیز لگاتے ہوئے کہتی ہے کہ تمہیں اس کا ذرا بھی ہوش نہیں ہے کہ تم کب سے سو رہے ہو اور کتنا سو چکے ہو۔ ملاحظہ فرمائیں ابتدائی بند......

بتاؤ تا بکے رہو گے غفلتوں میں چور تم
رہو گے تا بکے بھلا عمل سے دور دور تم
بتاؤ تا بکے رہو گے یوں ہی بے شعور تم
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
اٹھو اٹھو قسم ہے اب بہت ہی سو چکے ہو تم
ہنسو بھی اور ہنساؤ بھی بہت ہی رو چکے ہو تم

ذرا سا ہوش بھی تو لو کہ کتنا کھو چکے ہو تم
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمھاری بے حسی سے یہ حیات بھی اداس ہے
جو تم اداس ہو تو کائنات بھی اداس ہے
وہ دیکھو چاند تاروں کی برات بھی اداس ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

نوجوانوں کو ان کا ماضی یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ سوال بھی کیا گیا ہے کہ آخراب کیا بات ہوگئی کہ تم میں وہ تازگی وہ توانائی اور وہ قوت نہیں رہ گئی جس کے بل بوتے پر تم اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرکے آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ان کو یہ بتانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ آج پھر ان کے جوش عمل کی دنیا کو ضرورت ہے۔ آج ایک بار پھر ملک کا نشیمن بجلیوں کی زد پر ہے جو اسے خس وخاشاک میں بدل دینے کو بے چین ہیں۔

حیاتِ جد و جہد سے بھی کھیلتے تھے تم کبھی
حوادثات وقت کو بھی جھیلتے تھے تم کبھی
قسم ہے آندھیوں کی طرح پھیلتے تھے تم کبھی
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
ذرا بتاؤ سست گام ہو گئے ہو آج کیوں
ابھی تو کل ہی جاگتے تھے سو گئے ہو آج کیوں
یہ کیسا پردہ پڑ گیا ہے کھو گئے ہو آج کیوں

بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

خبر ہے کچھ خزاں کی زد میں ہے جمالِ گلستاں
زمیں پہ آگ ہر طرف اگل رہا ہے آسماں
تڑپ رہی ہیں بجلیاں ، بھڑک اٹھا ہے آشیاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہاری راہ تک رہی ہیں حوصلوں کی بجلیاں
تمہارے انتظار میں ہیں عزم کی وہ بدلیاں
پکارتی ہیں دیکھو دیکھو زندگی کی وادیاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے نقش گام کی زمانے کو تلاش ہے
تمہاری صبح وشام کی زمانے کو تلاش ہے
تمہارے دور جام کی زمانے کو تلاش ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
تمہارے رسم وراہ کی جہاں کو پھر تلاش ہے
تمہارے عزّ و جاہ کی جہاں کو پھر تلاش ہے
تمہارے مہر وماہ کی جہاں کو پھر تلاش ہے

بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

جریدہ ترجمان کے سابق ایڈیٹر شیخ رضاء اللہ عبد الکریم مدنی نے اس نظم پر اس طرح تبصرہ کیا ہے......

''۷۲-۱۹۷۱ء کی بات ہے جب پہلی بار اپنے ایک ساتھی مولوی عظمت اللہ مرحوم کی زبانی ہم نے ''وقت کی پکار'' نامی طویل اور انقلابی نظم سنی تھی وہ ضلع لبستی کے کسی دیہات کے باشندے تھے اور مدرسہ سبل السلام میں ہمارے ہم درس تھے۔ اس وقت اس طویل اور پر درد نظم کے کہنے والے کا کوئی شعور نہ تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نظم اپنے مدعا اور مقصد میں کامیاب تاثیر اور انقلابی خیالات کی حامل لگی تھی اور آج ۲۰۰۳ء میں جب اس نظم کا مکمل متن اس چھوٹے اور مفید مجموعے میں پڑھا تو ایسا لگا کہ یہ نظم اپنے مقصد میں آج بھی جواں اور اتنی ہی کارآمد ہے جتنی اس وقت تھی جب اس کو شاعر نے کہا تھا۔ ان کی شاعری میں یاس ونا امیدی، شکست خوردگی اور قنوطیت کے لیے کوئی جگہ نہیں وہ ہمیشہ نئے افق اور نئے میدان تلاش کرتے ہیں اور قوم کو عزم وحوصلہ وہمت ومردانگی کی تلقین کرتے ہیں اور قوم کو اپنے ماضی کی شاندار تاریخ سے وابستہ کرکے نئے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔''

(جریدہ ترجمان فروری ۲۰۰۴ء)

جمعیت اہل حدیث بمبئی نے ۲۰۰۳ء میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا اصغر علی سلفی نے بمبئی سے بارہ بجے رات میں اس خاکسار کو فون کیا اور کہا اسی وقت اس نظم کو فیکس کیجیے اس نظم کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ پاکوڑ کی آل انڈیا کانفرنس میں بھی اس نظم کو پڑھا گیا۔ ایڈیٹر ماہنامہ نوائے اسلام دہلی مولانا عزیز عمر سلفی نے جمعیت اہل حدیث کے دوروزہ کنونشن میں خاص طور سے اس نظم کا حوالہ دیا اور کہا کہ یہ نظم جذبات کو جھنجھوڑتی ہے

اور قدم آگے بڑھانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اس نظم کا یہ شعر

بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

خاص طور سے ضرب المثل بن گیا ہے۔ اس شعر کو خطباء اپنی تقریروں میں، قلم کار اور صحافی اپنے مضامین میں استعمال کر کے قوم کے جذبات کو مہمیز لگاتے ہیں۔ ان کے اندر جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دہلی میں صحافت سے وابستہ نوجوان اسکالر سعید اختر اعظمی نے ''وقت کی پکار'' پر بڑی خوب صورت زبان میں کچھ اس انداز سے تبصرہ کیا ہے......

''منزلوں کا بلاوا اور انتظار، وقت کی پکار پر قدموں کی جنبش مرکزی نظم کے ہر بند میں ایک عزم نو کی بیداری کا باعث بنتی ہے۔ تیس بند پر مشتمل یہ نظم خواب غفلت سے بیداری کے ساتھ ردائے بے حسی کو چاک کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ دلوں کی حرارت کو برقرار رکھتے ہوئے جہاں عزم جواں کے ساتھ موج بیکراں سے ٹکرانے پر زور دیا گیا ہے وہیں تاریک حال و ماضی کے مقابلے میں درخشاں ماضی کو بھی پیش کیا گیا ہے جس کے روشن خطوط کو اپنا کر فردا اور امروز کو ایک رنگ میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ شاعر نے قدم قدم پر حوصلوں کی کہکشاں سجانے کے ساتھ تاب و توانائی میں بھی نئی جان ڈالی ہے'' (قومی آواز ۹ جنوری ۲۰۰۵ء)

نصف صدی سے بھی زائد عرصہ قبل لکھی گئی اس نظم کا ایک ایک لفظ، ایک ایک بند اور ایک ایک مصرع آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ اس کو پڑھ کر قاری جھوم جھوم اٹھتا ہے، سامع کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے، اس کا ایمانی جذبہ بحر ذخار کی لہروں کی مانند جوش مارنے لگتا ہے۔

اس پوری نظم میں جوش ہے، ولولہ ہے، حرارت ہے، قوت ایمانی کا مظاہرہ ہے اور نوجوانوں کو ان کے فرائض یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن کہیں بھی اس میں منفی انداز

اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ کہیں بھی باطل قوتوں کی پیروی نہیں سکھائی گئی ہے۔ پوری نظم تعمیری سوچ اور مثبت پہلو لیے ہوئے ہے تا کہ نوجوانوں میں جو جوش وجذبہ پیدا ہو اس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچنے کے بجائے سسکتی انسانیت کو سہارا دیا جا سکے۔ اس کے زخموں پر مرہم پاشی کی جا سکے اور آج انسانیت کو جس سکون واطمینان کی ضرورت ہے وہ اسے مہیا کرایا جا سکے۔ نظم کے آخری بندوں میں نوجوانوں کو ملک کا، مذہب کا اور انسانیت کا قائد قرار دیا گیا ہے۔ انھیں یہ یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر وہ یوں ہی سوتے رہے تو انسانیت سسکتی رہ جائے گی اور اگر وہ بیدار ہو گئے تو زخمی انسانیت کو ایک مسیحا مل جائے گا۔ یہ نظم نصف صدی سے بالخصوص مدارس کے نوجوانوں کے اندر ایک تعمیری سوچ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ آج بھی دینی جلسوں میں یہ نظم پیش کی جاتی ہے اور اس سے ترغیب وتحریک حاصل کی جاتی ہے۔ یہ پوری نظم نہ صرف نوجوانوں کے لیے بلکہ دوسری عمر کے لوگوں کے لیے بھی اپنے اندر ایک پیغام رکھتی ہے اور ان کے اندر حرارت اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔ آج بھی ہر عمر کے لوگ اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے بند گنگناتے ہیں۔ اس لیے قارئین کے ذوق وشوق کی تکمیل کی خاطر ہم یہ مکمل نظم یہاں پیش کر رہے ہیں......

بتاؤ تا بکے رہو گے غفلتوں میں چور تم
رہو گے تا بکے بھلا عمل سے دور دور تم
بتاؤ تا بکے رہو گے یوں ہی بے شعور تم
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
اُٹھو اُٹھو قسم ہے اب بہت ہی سو چکے ہو تم
ہنسو بھی اور ہنساؤ بھی بہت ہی رو چکے ہو تم
ذرا سا ہوش بھی تو لو کہ کتنا کھو چکے ہو تم
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہاری بے حسی سے یہ حیات بھی اداس ہے
جو تم اداس ہو تو کائنات بھی اداس ہے
وہ دیکھو چاند تاروں کی برات بھی اداس ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

نہیں ہے تم میں تازگی تو پھولوں سے ادھار لو
نہیں ہے تم میں روشنی تو تاروں کو اتار لو
ہے راہ پُر خطر اگر تو عزم کو پکار لو
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

جو سو رہے ہیں غفلتوں میں ان کو بھی جھنجھوڑ دو
طلسم بے حسی کے آج، تانے بانے توڑ دو
جو گردنیں خلاف اٹھیں بڑھو انہیں مروڑ دو
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
تمہارا ولولہ جواں، تمہارا عزم نوجواں
تمہاری ہے زمین بھی تمہارا ہے یہ آسماں
تمہی ہو نائب خدا تمھارا ہے یہ کل جہاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے عزم و حوصلے کی کون تاب لائے گا
تمہاری موج بیکراں کی زد پہ کون آئے گا
جو آئے گا مقابلے میں منہ کی اپنی کھائے گا
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

بتاؤ تم پہ چھا رہی ہے آج کیوں فسردگی
نظر نظر سے ہے عیاں نہ جانے کیوں شکستگی
تمہارے حسن زندگی کی کیا ہوئی شگفتگی
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

حیاتِ جد و جہد سے بھی کھیلتے تھے تم کبھی
حوادثات وقت کو بھی جھیلتے تھے تم کبھی
قسم ہے آندھیوں کی طرح پھیلتے تھے تم کبھی
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
ذرا بتاؤ ست گام ہو گئے ہو آج کیوں
ابھی تو کل ہی جاگتے تھے سو گئے ہو آج کیوں
یہ کیسا پردہ پڑ گیا ہے کھو گئے ہو آج کیوں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

خبر ہے کچھ خزاں کی زد میں ہے جمالِ گلستاں
زمیں پہ آگ ہر طرف اگل رہا ہے آسماں
تڑپ رہی ہیں بجلیاں ، بھڑک اٹھا ہے آشیاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہاری راہ تک رہی ہیں حوصلوں کی بجلیاں
تمہارے انتظار میں ہیں عزم کی وہ بدلیاں
پکارتی ہیں دیکھو دیکھو زندگی کی وادیاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے نقش گام کی زمانے کو تلاش ہے
تمہاری صبح وشام کی زمانے کو تلاش ہے
تمہارے دور جام کی زمانے کو تلاش ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
تمہارے رسم وراہ کی جہاں کو پھر تلاش ہے
تمہارے عزّ و جاہ کی جہاں کو پھر تلاش ہے
تمہارے مہر وماہ کی جہاں کو پھر تلاش ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

ہے کچھ بھی ذوق وشوق تو قدم بڑھاؤ دوستو
ہے کچھ بھی عزم وحوصلہ علَم اٹھاؤ دوستو
ہے کچھ بھی جوش و ولولہ بگل بجاؤ دوستو
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

کھڑے ہو کیوں، رکے ہو کیوں بتاؤ سوچتے ہو کیا؟
ادھر ادھر غلط نظر سے آج دیکھتے ہو کیا؟
پتہ تو کچھ چلے ذرا کہ کس سے بولتے ہو کیا؟
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

گناہ ہے گناہ ہے، قسم ہے یوں ہی دیکھنا
اندھیرا ہے تو چل پڑو جلا کے شمع پُر ضیا
فضائے کائنات اگر خلاف ہے تو کیا ہوا
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
شکستہ دست وپا ہو کیوں شکستہ دل ہو کیوں بھلا
اٹھو اٹھو، بڑھو بڑھو، دکھاؤ اپنا حوصلہ
غضب کا جوش وعزم ہے عجب تمہارا حوصلہ
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

لگادو ظلمتوں کے خرمنوں میں آج آگ تم
سنوار دو قسم ہے دیکھو! کہکشاں کی مانگ تم

یہ قافلے بھی جس سے چل پڑیں وہ چھیڑو راگ تم
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے مسکرانے سے زمانہ مسکرائے گا
جو شمع تم جلاؤ گے جہاں بھی جگمگائے گا
تمھی جو جاگ جاؤ گے تو کون سونے پائے گا
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

وہ دیکھو دیکھو پَو پھٹی ، کھسک رہی ہے تیرگی
اِدھر اُدھر افق میں دیکھو روشنی بکھر گئی
سنور چلی ہے کائنات ، زندگی نکھر گئی
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
تم ہی کو ڈھونڈتے ہیں اب اندھیرے بھی اجالے بھی
تمہاری جستجو میں مسجدیں بھی ہیں شوالے بھی
تمہاری ہی تلاش میں ہیں ذرے بھی ہمالے بھی
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے ماسوا نہیں جہاں کا کوئی حکمراں
حیات و کائنات کے تمھی ہو صرف پاسباں

تمھیں تلاش کررہی ہے زندگی کہاں کہاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمہارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

جہانِ آب وگل میں بس تمہی سے اک اجالا ہے
تمہی سے دین پاک کا جہاں میں بول بالا ہے
تمہارا طرزِ زندگی انوکھا ہے نرالا ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہارے رنگ و نور کی وہ ہنس رہی ہے کہکشاں
تمہارے حسن وعشق کی عجیب تر ہے داستاں
تمہارے سوز وساز کا حسین ہے ہر اک جہاں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
زباں زباں پہ آج بھی تمھارا ہی فسانہ ہے
تمھاری ذات اب بھی بے نظیر ہے یگانہ ہے
فضائے نو میں زندگی کا بس یہی ترانہ ہے
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

خرد کا ذکر چھوڑ دو جنوں سے اب تو کام لو
اٹھا کے ساز توڑ دو خوشی سے تیغ تھام لو

قسم تمھیں نہ جام لو نہ دخت رز کا نام لو
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمہیں حیات جاوداں ملے گی کائنات میں
تمہارا ذکر خیر ہوگا بزم شش جہات میں
مگر ہے شرط تم بڑھے چلو رہ حیات میں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

تمھارے ہی جلو میں ضوفگن ہے بزم آسماں
تمھارا منتظر ہے زندگی کا آج کارواں
تمھی ہو رہبر جہاں ، جہاں کے تم ہو پاسباں
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے
تمھی ہو خضر رہ تمھی ہو انجم ضیا فگن
تمھی ہو جان زندگی تمھی ہو روح انجمن
تمھی ہو نازش وطن تمھی ہو رونق چمن
بلا رہی ہیں منزلیں تمھارا انتظار ہے
قدم بڑھاؤ ساتھیو یہ وقت کی پکار ہے

○○

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم
بحیثیت شاعر اطفال

اردو میں بچوں کے ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ادب اطفال پہلے صرف کتابوں میں ہوا کرتا تھا۔ رسالوں اور جریدوں کی اشاعت کے ساتھ یہ ان میں بھی منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں پر ادب اطفال کو جگہ ملنے لگی۔ لیکن اب بھی یہ سب سے زیادہ کتابوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ نثر کی شکل میں بھی اور نظم کی شکل میں بھی۔

پہلے بچوں کے ادب میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم، صاف ستھری اور کردار سازی کی باتوں پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں کمی آتی گئی۔ شاعری کی بات کریں تو اب پہلے کے مقابلے میں بچوں کے لیے شاعری کرنے والے کم ہو گئے ہیں اور ان میں بھی جو لوگ بچوں کے لیے شاعری کر رہے ہیں ان میں وہ بات نہیں ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ بہر حال یہ سلسلہ چل رہا ہے اور امید ہے کہ چلتا رہے گا۔ ادب اطفال کی اس وقت بہت ضرورت ہے۔ ٹی وی کلچر نے تعمیری ادب اطفال کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب بچے اسمٰعیل میرٹھی جیسے شاعروں کے کلام کو کم اور ہیری پوٹر جیسے ناولوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے ذہن کو تعمیری سمت میں موڑا جائے۔ ان کو مخرب اخلاق ادب سے دور کرنے اور کردار سازی والے ادب کی طرف مائل کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ آج ایسی شاعری اور ایسے مضامین کی ضرورت ہے جو بچوں کو اچھا انسان بنا سکیں اور ان میں خدمت انسانیت کا جذبہ پیدا کر سکیں۔ پہلے کے ادباء اور شعراء

ان باتوں پر بہت دھیان دیتے تھے لیکن اب ادب اطفال میں بہت بدلاؤ آگیا ہے۔

ادب اطفال کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں اس بارے میں بچوں کے ادیبوں نے اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس قسم کا ادب بچوں میں تعمیری ذہن اور سوچ پیدا کر سکتا ہے اور کس قسم کا ادب ان کے لیے نقصاندہ ہے۔ مشیر فاطمہ اس بارے میں اپنی رائے رکھتے ہوئے کہتی ہیں:

''بچوں کے ادب کی تخلیق بھی ایک فن ہے۔ بچوں کے ادب کا ایک مقصد ہونا چاہیے۔ بچوں کے ادب کی تنقید اس بنیاد پر کرنی چاہیے کہ کیا وہ بچوں کی ذہنی وجسمانی نشو ونما میں مدد کرتا ہے''۔

مرزا ادیب کہتے ہیں......

''بچوں کا ادب ایسا ہونا چاہیے جو ان کے تخیل کو متحرک کرے''۔

شفیع الدین نیر کے خیال میں......

''بچوں کے لیے ایسے عنوانات کے تحت نظمیں، کہانیاں یا مضامین ہوتے ہیں جن میں صحت، صفائی، تفریح، درس اور محنت ومشقت کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے''۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے خیال میں......

''بچوں کے ادب کی ایک نمایاں خوبی تنوع ہے۔ لہٰذا بچوں کے لیے موضوعات میں رنگارنگی ہونی چاہیے''۔

بعض دوسرے ادیبوں کے مطابق بچوں کے لیے لکھتے وقت بچوں کی ذہنی سطح پر اتر کر آنا پڑتا ہے۔ لکھنے والا اپنی ذہنی بلندیوں سے نیچے اتر کر بچوں کی سطح پر آئے اور وہی کچھ محسوس کرے جو بالعموم بچے محسوس کرتے ہیں۔ ایک انگریز نقاد کے خیال میں بچوں کے لیے جو ادب دلچسپ ہوگا وہ بڑوں کے لیے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یعنی بچوں کے لیے ایسا ادب ہونا چاہیے جو اگر بچے دلچسپی سے پڑھیں تو بڑے بھی اسی دلچسپی سے پڑھیں۔

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی شاعری انتہائی متنوع ہے۔ اس میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ ان کی شاعری کی کئی خوبیاں ہیں جن میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شاعر اطفال

بھی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی اصلاحی اور اسلامی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ان کو نہ صرف بچوں نے بلکہ بڑوں نے بھی پسند کیا ہے۔ بچوں کے لیے وہی شاعری اچھی شاعری مانی جاتی ہے جس میں اخلاقی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہو، جس میں کردار سازی کا جوہر موجود ہو، جو انسانیت کا درس دیتی ہو۔ اس کے ساتھ جو انتہائی آسان زبان میں ہو، جس کو پڑھنے میں بچوں کو کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔ وہ آسانی سے انہیں ازبر ہو جائے اور اسے بڑوں کے سامنے پڑھنے میں انہیں کوئی مشکل درپیش نہ ہو۔

اگر ہم ان خصوصیات کی روشنی میں ڈاکٹر انجم انصاری کی بچوں کے لیے کی گئی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالیں تو پائیں گے کہ ان میں مذکورہ خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ سادہ اور عام فہم زبان میں ہیں۔ ان کو یاد کرنا آسان اور بڑوں کے سامنے سنانا اور بھی آسان ہے۔ ان میں اخلاقی درس نمایاں ہے۔ ان میں کردار سازی کا جوہر موجود ہے۔ بچوں کے لیے ان کے جو شعری مجموعے بہت مقبول ہوئے ان میں بچوں کے نغمے، نغمہ زار انجم، اسلامی ترانے، نعت کے پھول اور لاہوتی نغمے قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مجموعوں کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ اور عام فہم زبان میں تو ہیں ہی، چھوٹی چھوٹی بحور میں ہیں اور بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ یہ نظمیں بچوں پر تھوپی گئی ہیں بلکہ تمام نظمیں یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہیں کہ ان میں بچوں کی نظموں کے لیے ضروری تمام اوصاف اور اجزا موجود ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ تمام مجموعے دو دو اور تین تین ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور نہ صرف بچوں سے بلکہ بڑوں سے بھی داد و تحسین کے پھول وصول کر چکے ہیں۔ بچوں کے نغمے نامی مجموعہ تو اب ناپید ہو چکا ہے۔

''اسلامی ترانے'' میں شامل دعا کے چند اشعار دیکھیں آپ کو میری باتوں کی تائید کرنی پڑے گی......

یارب دین کی دولت دے
علم عطا کر عزت دے

دولت دے اور برکت دے
بخل سے ہم کو نفرت دے
کام آئیں ہم لوگوں کے
ہم کو جذبۂ خدمت دے
پڑھ لکھ کر ہوشیار بنیں
عقل بھی دے اور حکمت دے
باطل سے لڑ جائیں ہم
وہ قوت وہ طاقت دے
انجم کو اور ہم کو بھی
دونوں جہاں میں عزت دے

''اسلامی بچے'' کے عنوان سے ایک نظم کے بعض اشعار بطور نمونہ پیش ہیں......

ہم ہیں اسلامی بچے
سیدھے سادے اور سچے
ہاتھ میں پرچم ایماں ہے
لب پر نغمۂ قرآں ہے
علم کی شمع جلاتے ہیں
ظلمت جہل مٹاتے ہیں
باطل سے ٹکرانا ہے
پرچم حق لہرانا ہے
رومی ہیں نہ شامی ہیں
انجم ہم اسلامی ہیں

علامہ اقبال کے ترانۂ ہندی کے طرز پر اور اس کی زمین میں ''ہمارا ترانہ'' کے عنوان سے ایک نظم نغمہ زار انجم میں شامل ہے۔ اس نظم کے اشعار یوں ہیں:

کون ومکاں ہمارا سارا جہاں ہمارا
ہے یہ زمیں ہماری ہے آسماں ہمارا
ٹکرائے گا جو ہم سے مٹ جائے گا جہاں سے
اب بھی ہے ہم نشینو! جذبہ جواں ہمارا
لہرائے گا ہمیشہ پنہائے آسماں میں
ہرگز نہ جھک سکے گا ملی نشاں ہمارا
اقبال نے کہا تھا جو، میں بھی کہہ رہا ہوں
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
دنیا رہے گی جب تک ، جب تک رہے گا عالم
باقی رہے گا انجم نام ونشاں ہمارا

''لاہوتی نغمے'' میں جتنی نظمیں ہیں سب میں اللہ کی حمد بیان کی گئی ہے اور شاعری کی زبان میں بچوں کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دنیا کی تخلیق اللہ نے کی ہے، وہی ہمارا رب اور پالنہار ہے۔ اسی کی تعریف کی جانی چاہیے اور اسی کی حمد گانی چاہیے۔ اس کی تمام نظمیں ایسی دلکش ہیں کہ بچے ان کو آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ ان نظموں میں روانی ہے، دریا کا بہاؤ ہے اور اسی کے ساتھ آبشاروں کی نغمگی اور غنائیت ہے۔ بچے ان نظموں کو بار بار پڑھتے ہیں اور انہیں یہ بہت جلد ازبر ہو جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں......

کون ہمارا آقا ہے؟
مولا ہے اور داتا ہے؟
اللہ ہے بس اللہ ہے
کون ہمارا خالق ہے؟
مالک ہے اور رازق ہے؟
اللہ ہے بس اللہ ہے
کون مشیت والا ہے

قدرت حکمت والا ہے
اللہ ہے بس اللہ ہے

ایک دوسری نظم کے بند حاضر ہیں......

اک بات بتاتا ہوں ہمدم
اک نغمہ سناتا ہوں ہمدم
آئینہ دکھاتا ہوں ہمدم
فرمایا نبیؐ نے منبر پر
اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں

یہ لیل و نہار و صبح و مسا
یہ شمس و قمر یہ ارض و سما
یہ موت و حیات یہ روح شفا
آخر میں پکارا سب نے یہی
اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں

یہ کاہکشاں انجم کا نگر
پورب، پچھم، دکھن، اتر
جس سمت بھی اٹھ جاتی ہے نظر
اس سمت سے آتی ہے یہ صدا
اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں

''لاہوتی نغمے'' بھی بچوں کی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ اس میں ۲۱ حمدیہ نظمیں ہیں جو مخمس، مسدس اور غزلیہ آہنگ میں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں ایسے مضامین نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے بچوں کے دلوں میں اللہ کی عظمت اور توحید کی حقیقت راسخ ہو جائے۔ ''لا الہ الا ہو'' کے عنوان سے لکھی گئی اس کی ایک نظم سنتے چلیں......

ہے یہ دل کی آرزو
روز و شب ہو گفتگو

قریہ قریہ کو بہ کو
لاَ الٰـــہَ الاَّ ھُـــو
اہل دل کا مدعا
قلب مومن کی صدا
عرش سے آئی ندا
لاَ الٰـــہَ الاَّ ھُـــو
کلمۂ عرفاں ہے یہ
نغمۂ رحماں ہے یہ
عظمت انساں ہے یہ
لاَ الٰـــہَ الاَّ ھُـــو

''اسلامی ترانے'' میں جو نظمیں ہیں ان میں بچوں کو اسلام کے احکامات شاعری کی زبان میں بتائے گئے ہیں۔ ان کو جہاں انسان بننے کی تلقین کی گئی ہے وہیں انہیں اسلام کے ارکان پر عمل کرنے کا درس بھی دیا گیا ہے۔ ان نظموں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جہاں ایک طرف بچوں کو اسلامی بچے بننے کی تلقین کی گئی ہے وہیں دوسری طرف دیگر مذاہب کا احترام بھی سکھایا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمیں دوسروں کے مذاہب کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس مجموعہ میں ایک نظم کا عنوان ہے ''نمازی بنو'' جس میں بچوں کو نماز کی ادائیگی کی طرف راغب کیا گیا ہے اور بہت ہی پیارے انداز میں کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سنو پیارے بچو نمازی بنو
مسلمان تم ہو نمازی بنو
جہاں بھی رہو اور جہاں جاؤ تم
خدا کو نہ بھولو نمازی بنو

رہو جب تلک بزم دنیا میں تم
پڑھو، علم سیکھو نمازی بنو
کہو بے نمازی مسلماں سے بھی
مسلماں اگر ہو نمازی بنو

''اسلامی ترانے'' میں کل ۱۹ نظمیں ہیں۔ اس کی بیشتر نظموں سے بچوں کی اسلامی تربیت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سعید اختر اعظمی نے ''اسلامی ترانے'' پر اس طرح تبصرہ کیا ہے......

''اسلامی ترانے میں حمد و نعت کے علاوہ دعا، مذہب، فرض، عزائم، تعلیم دین اور رمضان وعید نیز قربانی کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ان ترانوں میں مرد مومن کا مدعا اور اس کا مقصد نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ دین کی دولت، علم، جذبہ خدمت، عقل وحکمت، شرافت، دنیا کے جاہ وحشم اور عقبیٰ کی جنت کی تمنا بھلا کس بندۂ خدا کی نہیں ہوتی۔ اس کے لیے مسلمان کو نمازی، زاہد، غازی، حجازی، اور غزالی و رومی و رازی کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا لازمی ہے۔ رمضان کی آمد پر اظہار مسرت کرنے اور عید پر مہکتی فضاؤں کو لہرانے میں وہ اسلام کی روح کو فراموش نہیں کرتے۔ ان میں سادگی، سلاست، گراں بار الفاظ سے گریز اور سادگی کا وہ عالم ہے کہ بسا اوقات یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ان نظموں کا مخاطب صرف بچے ہیں۔ بعض نظموں کا مخاطب نونہالان اسلام ضرور ہیں لیکن ان کا دائرہ وسیع ہے جو بیک وقت قوم مسلم سے جاملتا ہے۔ ان میں مخمس اور غزلوں کے رنگ کو بخوبی برتا گیا ہے جسے گنگناتے ہوئے کسی دشواری اور ثقالت کا احساس نہیں ہوتا''۔

(قومی آواز ۹ رجنوری ۲۰۰۲ء)

''نعت کے پھول'' بچوں کے لیے کہی گئی اٹھارہ نعتوں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس میں ''شاعر رسولؐ حرا'' نے طیبہ کی سرزمین سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے مدحت نبیؐ کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔ وہ حضور اکرمؐ کو دلدار مدینہ، فخر پیمبر، سرکار دو عالم، حبیب کبریا، خیر

البشر، خاتم المرسلین، شاہ امم، دلبر کونین کے اعزاز سے نوازتے ہوئے جہاں ان کے سندر مکھڑے پر چاند ستاروں کو قربان کرتے ہیں وہیں طیبہ کے نظاروں سے اپنی روحانی سرشاری کا سامان بھی کرتے ہیں۔ مذہب اسلام کے پیروکار وہم وگماں میں نہیں بلکہ حسن یقین کے قائل ہیں۔ انجم بھی حامل قرآن ہیں اس لیے اپنی نعتوں میں جابجا انہوں نے اس ہستی کو سراپا قرآن کہا جو ہدایت کا سامان لے کر آئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہندی، مصری، رومی وشامی ان کے کلمہ گو ہیں اور حافظ وقاری عالم وعامی ان کا وصف بیان کرتے ہیں تو کیا ہم پر لازم نہیں کہ ان کا اسم گرامی آتے ہی درود وسلام پڑھ لیا کریں۔

''نغمہ زار انجم'' میں حمد ونعت اور اسلامی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کے مشہور روزنامہ ''قومی آواز'' کے شعبہ ادارت سے وابستہ رحمت اللہ فاروقی نے لکھا ہے......

''اس میں ایسی نعتیں اور نظمیں شامل ہیں جنہیں پڑھ کر قلب وجگر کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایک شعر سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور دیار حرم کے ساتھ عقیدت ووابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت انجم کی شاعری میں جگہ جگہ حمیت ملی کو بیدار کرنے کی کامیاب سعی نظر آتی ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے میں کیسے دیکھوں؟ وہ حق کی سر بازار رسوائی اور شرک کی گرم بازاری کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ یہ اشعار ان کی سوزش پنہاں کے غماز ہیں:

حق ہے رسوا سر بازار میں کیسے دیکھوں
مرد مومن بھی ہے بیمار میں کیسے دیکھوں
میں موحد ہوں مرے پاس ہے توحید الہ
گرم ہے شرک کا بازار میں کیسے دیکھوں

عصر حاضر میں خون مسلم کی ارزانی پر وہ یوں نالہ کناں نظر آتے ہیں......

محفل کفر میں ایمان ہے رسوا رسوا
اہل ایماں ہیں سرِ دار میں کیسے دیکھوں

(ہفت روزہ اخبار نو، ۲۷ فروری ۲۰۰۲ء/ جریدہ ترجمان اپریل ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر سید معصوم رضا نے ''نغمہ زار انجم'' پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''نغمہ زار انجم'' کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شاعر کا مذہبی جذبہ قوی ہے۔ وہ مسلمانوں کی اصلاح کی نسبت سے کبھی کبھی سخت لہجہ اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی طنزیہ انداز میں بھی ان کی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں۔''

''باوجود تمام تیر و نشتر کے شاعر نے اسلام کا پرچم ہر جگہ بلند کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور اسی امید کے ساتھ انہوں نے کئی جگہ اپنی اس بات کو مختلف انداز میں شعری جامہ پہنا کر دہرایا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار......

مسلماں ہوں میں، میرا ایماں ہے جوہر
یہی بات سب کو بتانے چلا ہوں
جذبۂ دین ہدایت کو جگانا ہوگا
پرچمِ مذہبِ اسلام اُڑانا ہوگا

نغمہ زار انجم میں حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہے۔ ملک میں فسطائی قوتوں کے عروج اور امن و امان کی حامل انسانی طاقتوں کے کمزور پڑنے پر نوحہ خوانی بھی کی گئی ہے۔ شاعر کو اس بات پر بہت قلق ہے کہ ملک میں شر پسند قوتیں مضبوط ہو رہی ہیں جو انسانیت کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ فسطائی قوتوں کے خلاف صف آرا ہوا جائے اور انسانیت کی علمبردار قوتوں کو استحکام بخشا جائے۔ ان اشعار میں شاعر کی دردمندی اور اس کا کرب پوری طرح نمایاں ہے......

عصمت مریم و تقدیس خواتین حرم
لٹ رہی ہے سر بازار میں کیسے دیکھوں
غیرت یوسف ایماں بھی ہے پانی پانی
کفر ہے اس کا خریدار میں کیسے دیکھوں

ہے ہدف ہند میں تنقید کی تنقیص کی بھی
امت سیدِ ابرار میں کیسے دیکھوں

اس شعر میں جو کچھ اشاروں کنایوں میں کہا گیا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے قاری کا ذہن خود اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں شاعر پہنچانا چاہتا ہے:

ہائے وہ شخص جو قاتل ہے ہزاروں سر کا
اس کے ہی سر پہ ہے دستار میں کیسے دیکھوں
ہر کوئی آج ہے مظلوم اور مجبور یہاں
ننگی ہے ظلم کی تلوار میں کیسے دیکھوں

ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس جانب بھی اشارے کیے گئے ہیں:

ہر ایک سمت اندھیرا ہے تیرگی ہے بہت
جلاؤ شمع فروزاں بڑی ضرورت ہے
خلوص و خلق و محبت کا ذکر کرتے رہو
یہ سب ہیں دین کے ساماں بڑی ضرورت ہے
اب اپنا ساز اٹھاؤ تو کوئی بات بنے
وفا کے گیت جو گاؤ تو کوئی بات بنے
روش روش ہے چمن کی اداس کیا ہوگا
گلاب ولالہ کھلاؤ تو کوئی بات بنے
جو روٹھ روٹھ کے بیٹھے ہیں اپنے لوگوں سے
انہی کو یارو مناؤ تو کوئی بات بنے
جہاں میں گھور اندھیرا ہے ہر طرف انجم
چراغ راہ جلاؤ تو کوئی بات بنے

○○

کلامِ انجم میں انقلابی آہنگ

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم اسلامی شاعر ہیں۔ ان کی تمام تر شاعری اسلامی تعلیمات کے محور پر گردش کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام سے اخلاقی، اسلامی اور انسانی درس دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے خاص طور پر نوجوانوں سے خطاب کیا ہے۔ دوسرے لوگ بھی ان کے مخاطب ہیں لیکن وہ نوجوانوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نوجوانوں کا طبقہ اسلامی اور انسانی رنگ میں رنگ جائے۔ وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ ان کو آواز دیتے ہیں۔ انہیں ان کا ماضی یاد دلاتے ہیں اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ان کی شاعری میں انقلابی آہنگ بھی ہے۔ وہ خوابیدہ طبقات کو اپنی شاعری سے بیدار کرتے اور جھنجھوڑتے ہیں۔ انہیں ان کے فرائض یاددلاتے ہیں اور سستی و کاہلی کو خیرباد کہہ کر میدان عمل میں نکل پڑنے کے لیے للکارتے ہیں۔ ان کے کلام کی مانند ان کی شخصیت میں بھی انقلابی رنگ ہے۔ وہ حق اور سچ کے مقابل کسی کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ذاتی زندگی میں بھی ان کا یہی وطیرہ ہے اور ان کا کلام بھی یہی تأثر پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے حمدوں اور نعتوں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان میں بھی مخرب اخلاق اشعار نہیں ملیں گے۔ غزلوں میں بھی ایک شائستگی ہے، ایک وقار ہے، ایک تمکنت ہے۔ وہ فن شاعری کو اصلاح معاشرہ کے طور پر بھی اختیار کرتے ہیں اور اپنے کلام سے سماجی برائیوں کو ختم کرنے پر زور دیتے ہیں۔

ان کی طویل نظم وقت کی پکار سے متعلق مضمون میں بھی ان کی ان شاعرانہ خوبیوں

کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ جمود کے سخت خلاف ہیں۔ وہ حرکت و عمل کے شیدائی ہیں اور اپنی پوری شاعری میں یہی پیغام دینے کی کوشش انہوں نے کی ہے۔ ان کی کئی انقلابی نظمیں ان کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔ ان کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں یاسیت نہیں ہے۔ مایوسی نہیں ہے۔ قنوطیت نہیں ہے۔ بزدلی اور کم ہمتی نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ امید و یقین کے پیامبر ہیں۔ مایوسی اور سستی و کاہلی کے سخت خلاف ہیں۔ وہ پژمردہ دلوں کی تاریکی کو امید و یقین کی شمع کی روشنی سے بھر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ کوئی بھی گمراہ نہ ہو سکے اور اپنے انسانی و اسلامی فرائض سے دست کش نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم ''طلوع سحر'' کا بالخصوص ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے مایوس دلوں کو مژدہ جاں فزا سنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم ذیل میں پیش کی جارہی ہے......

پھر امن و اماں کا لے کے علَم خورشید نکلنے والا ہے
پھر لطف و کرم کا چشمۂ نو، عالم میں ابلنے والا ہے
پھر ذوق عمل سے بیگانہ انسان سنبھلنے والا ہے
امید کا اک اک غنچہ و گل، گلزار میں کھلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

افکار و حوادث بدلیں گے، یہ سارا زمانہ بدلے گا
کردار بھی سارے بدلیں گے، عنوانِ فسانہ بدلے گا
ہر ساز کی لرزش بدلے گی، اندازِ ترانہ بدلے گا
دنیا میں ہمارے جینے کا، دستور بدلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

ان رینگتے سایوں کو دیکھو، گھنگھور گھٹاؤں کو دیکھو
ویران پہاڑوں پر چڑھ کر، منحوس فضاؤں کو دیکھو

ظلمات کے پردوں کے پیچھے، پُرنور شعاعوں کو دیکھو
تاریکیاں مٹنے والی ہیں، فانوس بھی جلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

ہلکی پھلکی اُودی نیلی گھر کے گھٹائیں آئیں گی
پھر ابرِ بہاراں امنڈے گا، پھر مست فضائیں چھائیں گی
پھر بلبلیں اپنے گلشن میں وہ گیت خوشی کے گائیں گی
جس گیت کا سن کر زیر و بم، دل سب کا مچلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

احساس بدلنے والا ہے، جذبات بدلنے والے ہیں
آہنگ بدلنے والا ہے، نغمات بدلنے والے ہیں
موسم بھی بدلنے والا ہے، لمحات بدلنے والے ہیں
پھر حسن و محبت کا بادہ ساغر سے ابلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

انساں بھی بدلنے والا ہے، کچھ دیر نہیں تاخیر نہیں
وہ دیکھو ہلالی پرچم میں، الجھی ہوئی اب زنجیر نہیں
انجم کے سنہرے خوابوں میں، ایمان تو ہے تکفیر نہیں
پھر گوشۂ قلبِ عالم میں، ارمان مچلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

اس نظم میں مولانا انجم انصاری نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ جو لوگ حالات روزگار اور حوادث زمانہ سے پریشان ہیں اور مایوس ہو چکے ہیں انہیں اپنی پریشانی اور مایوسی کو

جھٹک دینا چاہیے کیونکہ یہ حالات ہمیشہ نہیں رہیں گے، ان میں تبدیلی آئے گی اور تاریکی کے بعد اجالا پھیلے گا۔ تبدیلی قانون فطرت کا ایک اٹوٹ اصول ہے۔ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں، ثبات صرف تغیر اور تبدیلی کو حاصل ہے۔ لہذا جو لوگ اپنے اور دنیا کے حالات پر ماتم کناں ہیں اور مایوس ہو کر خاموش بیٹھ گئے ہیں انہیں ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ وہ وقت دور نہیں جب سب کچھ بدل جائے گا۔ جب تاریکی چھٹے گی اور دنیا کو منور کر دینے والی آفتابی کرنیں پھوٹیں گی۔ دنیا میں ظلم و جبر کا جو سلسلہ چل رہا ہے وہ رکے گا اور کوئی نہ کوئی امن و امان کا پرچم لے کر ضرور اٹھے گا۔ وہ انسان جو ذوق عمل سے بیگانہ ہو گئے ہیں جنہیں یہ ہوش نہیں ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے کیا نہیں وہ بھی ایک روز بیدار ہوں گے اور ان کے کردار میں بھی تبدیلی آئے گی۔

وہ قارئین کو یہ باور کرانے کی کامیاب انداز میں کوشش کرتے ہیں کہ دنیا پر اس وقت جو مناظر چھائے ہوئے ہیں اور جو ہمارے لیے باعث تشویش ہیں اور جن کے خاتمے کی فی الوقت کوئی امید نظر نہیں آتی وہ ضرور بالضرور ختم ہوں گے۔ مایوسی کفر ہے، اپنے ایمان کو تر و تازہ اور شگفتہ رکھیں اور اپنے ایقان کی حرارت کو سرد نہ پڑنے دیں۔ اگر یہ سرد پڑ گئی تو پھر کون ہوگا جو اپنے کردار سے دنیا میں گرمی پیدا کرے گا۔ اس تبدیلی کے نقیب مناظر فطرت بھی ہیں جو مایوس انسانوں کو بلا بلا کر بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ امید کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو، مایوسی کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دو۔

اس ظلمت شب کے اے انجم خاموش نظارے کہتے ہیں
وہ دیکھو ! فلک پر رخشندہ سب چاند ستارے کہتے ہیں
دنیا کے نظارے کہتے ہیں ، فطرت کے اشارے کہتے ہیں
اب صبح بھی ہونے والی ہے ، سورج بھی نکلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

اس بند میں مناظر فطرت کے حوالے سے ایک پیغام دینے کی کوشش کی گئی

ہے۔ یہ جو دنیا کے مناظر بظاہر خاموش نظر آرہے ہیں وہ خاموش نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی زبان سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں اور کچھ اشارے کررہے ہیں۔ وہ اشارے کیا ہیں وہ پیغام کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ اب صبح ہونے ہی والی ہے، سورج نکلنے ہی والا ہے، تاریکی چھٹنے ہی والی ہے، اجالا پھیلنے ہی والا ہے اور اب ایسا انقلاب آفریں وقت آنے ہی والا ہے کہ سب کچھ یک لخت بدل جائے گا اور پوری کائنات تاریکی سے اجالے میں آجائے گی۔ یہ دورِ خزاں ابدی نہیں ہے، اسے بدلنا ہے اور بہار کو آنا ہی ہے۔ جب ایسا ہوگا تو اس سے پہلے ہلکی، پھلکی، اودی، نیلی گھٹائیں گھریں گی، ابر بہاراں امنڈے گا اور جھوم کر رحمت کی بارش ہوگی۔ پھر تو گلشن میں بلبلوں کے سحر انگیز ترانے سنائی دیں گے جن سے دلوں میں ایک ہیجان برپا ہوگا اور حرکت و عمل کے لیے وہ بے چین ہو جائیں گے۔ سب کے دل مچل اٹھیں گے اور سب خوشیوں کے نغمے گانے لگیں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ماحول بدلے گا بلکہ انسانوں کے جذبات بھی بدلیں گے، ان کی سوچ بدلے گی، ان کی فکر میں ایک تعمیری تبدیلی آئے گی اور پیار محبت اور امن وامان کا ساغر چھلکنے لگے گا۔ جب انسانوں کی سوچ بدلے گی ان کا زاویہ نظر تبدیل ہوگا تو یہ سماج بھی بدلے گا، یہ زمانہ بھی بدلے گا، یہ کائنات بھی بدلے گی۔ لہٰذا اے میرے دوست اے میرے غم گسار مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، یہ دور زیادہ دن نہیں رہے گا، اس کے بطن سے ایسا ماحول پیدا ہوگا جو دنیا میں امن وانسانیت کا پرچم بلند کرے گا۔

ایک طرف جہاں وہ نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ موجودہ ماحول میں تبدیلی آئے گی وہیں دوسری طرف وہ یہ بھی مژدہ سنارہے ہیں کہ کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو کسی بھی حال میں نہیں بدل سکتیں خواہ کتنے ہی انقلابات کیوں نہ آئیں۔ جو حق ہے وہ باقی رہے گا جو باطل ہے وہ مٹ کر رہے گا۔ ایک دوسری نظم میں جس کا عنوان ہے ''نعرہ مومن'' اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر......

محبوب خدا کی الفت کا عنوان نہ بدلا جائے گا
اسلام نہ بدلا جائے گا ایمان نہ بدلا جائے گا
یہ بات مسلم ہے یارو تاریخ بھی اس کی شاہد ہے
اللہ کا سچا وعدہ ہے قرآن نہ بدلا جائے گا

قرآن کریم کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں اس کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے وہیں اس کو بدنام کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ کچھ امن دشمن عناصر قرآن کریم پر پابندی کا بھی بیہودہ مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ سچ بات یہ ہے کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی مذہب اور اس کی مذہبی کتاب کے خلاف کوئی اہانت آمیز بات نہیں کی جانی چاہیے۔ ہر مذہب میں ایک دوسرے کے مذاہب کے احترام کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ اہانت انگیزی کرتے ہیں۔ شاعر نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مایوس ہونے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ نے خود وعدہ کر رکھا ہے کہ قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، وہ خود اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری نظم میں بھی انھوں نے اسی جانب اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ قرآن مقدس کے خلاف ہرزہ سرائی کر رہے ہیں انہیں سچائی کا علم نہیں ہے، اگر ہوتا تو وہ ایسا نہیں کرتے۔ نظم کا عنوان ہے ''نہ کھیلو'' اس کے چند اشعار ملاحظہ کریں......

تم شمع حرم مشعل ایماں سے نہ کھیلو
جل جاؤ گے دیکھو دل سوزاں سے نہ کھیلو
بازیچہ اطفال نہیں ملت بیضا
اللہ کا پیغام ہے قرآں سے نہ کھیلو
لبریز نہ ہو جائے کہیں جام تحمل
ہنس ہنس کے مری جان مری جاں سے نہ کھیلو

اسی طرح ایک نظم ''مسجد اقصیٰ'' ہے۔ وہ بھی انتہائی جوش و جذبات سے پر ہے اور اس کو پڑھ کر خون میں حرارت سی دوڑ جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے مسجد اقصی تجھے ہم لے کے رہیں گے
.........تجھے ہم لے رہیں گے
مانا مانا کہ خطا کار و گنہ گار ہیں ہم لوگ
دنیا کی نگاہوں میں بہت خوار ہیں ہم لوگ
ہر ایک کو معلوم ہے عظمت بھی ہماری
ہر ایک پہ بھاری ہے شجاعت بھی ہماری
اے مسجد اقصی تجھے ہم لے کے رہیں گے
.........تجھے ہم لے رہیں گے

اس نظم اور دوسرے نظموں کے اشعار ایسے ہیں جو ایک طرف انصاف پسند اور امن پرور نو جوانوں کو انسانیت کا درس دیتے ہیں تو دوسری طرف امن دشمن عناصر کو للکارتے بھی ہیں۔

○○

غزلوں اور نظموں کا جائزہ

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم نے یوں تو اسلامی شاعری ہی کی ہے۔ ان کی اصل فنی جولانگاہ نعت گوئی ہے۔ انہوں نے حمد بھی بڑی تعداد میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دوسرے شعراء کی مانند غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ اگر چہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے لیکن انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ کسی فنکار کے فن کا مجموعی جائزہ نہیں لیا جاتا اس کے فن کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح کسی شاعر کے فنی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کے لیے اس کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو دیکھنا پڑے گا اور اس کے تمام شعری سرمایے پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ کی نعتوں اور اسلامی نظموں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ غزلیہ اور نظمیہ شاعری کا بھی مطالعہ کیا جائے۔

آپ کے پچاس سال سے بھی زائد عرصے پر محیط شعری سفر کا جائزہ لیا جائے تو بے شمار غزلوں اور نظموں پر نظر پڑتی ہے۔ انہوں نے قصد کر کے غزلیں اور نظمیں نہیں کہی ہیں بلکہ منہ کا مزا بدلنے کے لیے اس جانب رخ کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تعداد کم نہیں ہے اور انہیں غیر معیاری بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ ''بربط انجم'' کے نام سے ۲۰۰۵ میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اوراق پریشاں کے عنوان سے نظمیں شامل کی گئی ہیں جن کی تعداد بیس ہے اس کے بعد رقص شرر کے عنوان سے غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

آپ کو اردو زبان سے بہت پیار ہے اور ہندوستان سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ یہ ہم

نہیں کہہ رہے بلکہ ان کا کلام بول رہا ہے۔ ''میرا وطن'' اور ''اردو زبان'' دو طویل نظمیں شامل مجموعہ ہیں۔ یہ دونوں نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہیں نہ تو اردو زبان کے ساتھ ہو رہی زیادتی قبول ہے اور نہ ہی اپنے وطن میں اپنی بے توقیری برداشت ہے۔ ''نقوش جاوداں'' کے مصنف ڈاکٹر شمس کمال انجم کہتے ہیں......

''آپ نے بہت ساری نظمیں بھی لکھی ہیں۔ آپ کے غزلیہ مجموعے ''بربط انجم'' میں کئی نظمیں شامل ہیں۔ آپ نے اردو زبان پر ایک ایسی نظم کہی ہے جس میں اردو کے ایک سو تیس مشاہیر کا بڑے دلپذیر انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اردو کے اتنے سارے شعراء و ادباء کا نام تو اردو کے اچھے اچھے اسکالر نہیں جانتے ہوں گے، چہ جائیکہ ان کو نظم میں باندھا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اردو زبان کی تاریخ سے کماحقہٗ واقفیت اور اس کے مشاہیر کی معرفت حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی نظم میں سو، سوا سو شعراء و ادبا ئکا نام ذکر کرنا بذات خود ایک انوکھی مثال اور نیا تجربہ ہے۔ ساتھ ہی اس کی زبان اور اسلوب میں پائی جانے والی شیرینی اور دلکشی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے''۔

بیس بند کی اس نظم میں ایک سو تیس مشاہیر اردو کے ناموں کی شمولیت یقیناً ایک بڑا کارنامہ ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ آپ کو اردو زبان کا کتنا مطالعہ ہے اور اس کے مشاہیر کے بارے میں کس قدر جانکاری ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو اردو کی پوری تاریخ سے واقف ہو۔

اردو کی زلف گرہ گیر کے دیوانے کہاں نہیں ہیں۔ کون ہے جو اس زبان کی شیرینی پر فدا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی اس کی عظمت کے معترف ہیں جو اردو نہیں جانتے۔ جو اس سے بغض و کینہ رکھتے ہیں وہ بھی اس کی تاثیر کے قائل ہیں۔ بیشتر شعرا نے اردو زبان کی شان میں قصیدے پڑھے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اردو زبان کی شان میں جو نظم لکھی ہے وہ

انتہائی دلکش ہے۔اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیں......

ندّی کا موڑ، چشمہ شیریں کا زیر و بم
چادر شب نجوم کی، شبنم کا رقص نم
موتی کی آب، گل کی مہک، ماہ نو کا خم
ان سب کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے تو
کتنے حسیں افق سے ہویدا ہوئی ہے تو

لہجہ ملیح ہے کہ نمک خوار ہوں ترا
صحت زبان میں ہے کہ بیمار ہوں ترا
آزاد شیر ہوں کہ گرفتار ہوں ترا
تیرے کرم سے شعر وسخن کا امام ہوں
شاہوں پہ خندہ زن ہوں کہ تیرا غلام ہوں

مولانا حامدالانصاری انجم نے اردو زبان پر جو نظم لکھی ہے وہ بھی کم اثر انگیز نہیں ہے۔اس میں بھی الفاظ کا زیر وبم ہے اور جذبات کی عکاسی ہے۔ یہ اس زبان سے محبت کا ثبوت ہے اور اس کے عشق میں دیوانگی کی حد تک گزر جانے کی کیفیات ہیں۔ چند ابتدائی بند ملاحظہ ہوں......

چاند تاروں کی اس میں لطافت بھی ہے
لالہ و گل کی خوشبو ہے رنگت بھی ہے
حسن والوں کی اس میں نزاکت بھی ہے
ہر ادا اس کی ہے گلفشاں گلفشاں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

نغمۂ زیر و بم اس کی آواز ہے
سوزِ دل کا امیں اس کا ہر ساز ہے

حسن و عشق و محبت کا اک راز ہے
زندگی اس کی ہے داستاں داستاں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

اردو زبان میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں تنگ نظری نہیں ہے۔ اس زبان میں تمام مذاہب کے خزانے موجود ہیں اور اس نے کسی کو بھی اپنے قریب آنے سے روکا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس میں اتنی گہرائی ہے کہ یہ زبان لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کی تعلیمات کو اس میں سمو دیں۔ یہی وجہ ہے کہ گیتا اور رامائن کے سب سے زیادہ اگر کسی زبان میں ترجمے ہوئے ہیں تو اردو میں ہوئے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کے بھی بیشمار تراجم اردو میں کیے گئے ہیں۔ احادیث اور فقہ کی کتابیں اس زبان میں بھری پڑی ہیں۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا انجم انصاری کہتے ہیں......

معترف آج ہے اس کا ہندوستاں
گونج اٹھا اس کے نغموں سے سارا جہاں
اس کی خوبی پہ شیدا ہیں اہلِ زباں
ساری دنیا میں ہے اس کا سکہ رواں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

اس میں وید اور قرآں کا پیغام ہے
حسن اخلاق و اخلاص کا جام ہے
یہ زباں کیا ہے، قدرت کا انعام ہے
ساری دنیا میں ایسی زباں ہے کہاں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس نظم میں تین سو شعرا و ادبا کے نام گنائے گئے ہیں جو اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اردو زبان و ادب کا شاید ہی کوئی بڑا نام اس نظم میں شامل

ہونے سے رہ گیا ہو۔ بہت سے ایسے شعراء وادباء بھی اس میں شامل ہیں جن کو زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن جن کے کارنامے کم نہیں ہیں۔ کسی کسی بند میں ناموں کی ایسی تکرار ہے کہ پڑھتے ہی بنتی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات تکرار بری لگتی ہے اور وہ حسن کے بجائے قبح بن جاتی ہے لیکن اس نظم میں یہ تکرار نظم کی خوبی بن گئی ہے۔ مثال کے طور پر......

اس میں نازشؔ، مجازؔ اور جذبیؔ بھی ہیں
اس میں شعریؔ، شفاؔ، کیفؔ و کیفیؔ بھی ہیں
عرشؔ، و عرشیؔ، فضاؔ، فیضؔ و فیضیؔ بھی ہیں
ہیں حمیدؔ اور بہزادؔ سے نعت خواں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

بند کے دوسرے اور تیسرے شعر میں جو عین اور فے کی تکرار ہے اس نے اس بند کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ کچھ بند اور پیش خدمت ہیں:

اس میں آزادؔ و سیدؔ ہیں، شبلیؔ بھی ہیں
محسن الملکؔ و اکبرؔ ہیں، حالیؔ بھی ہیں
داغؔ و ناسخؔ امیرؔ اور جلالیؔ بھی ہیں
اس میں غالبؔ سا ہے شاعرِ نکتہ داں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

ذوقؔ و سوداؔ سے اس کے پرستار ہیں
آتشؔ و مصحفیؔ سے فدا کار ہیں
دردؔ و انشاؔ ظفرؔ اور سرشارؔ ہیں
میرؔ و مومنؔ سے ہیں اس میں جادو بیاں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

جوشؔ و حسرتؔ، جگرؔ اور اصغرؔ بھی ہیں
شادؔ و فانیؔ، ریاضؔ اور مضطرؔ بھی ہیں
بزمِ میں اس کی مخمورؔ و ساغرؔ بھی ہیں
بیخودؔ و سائلؔ و نوحؔ ہیں پاسباں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

اس میں احساںؔ، شفیقؔ اور ماہرؔ بھی ہیں
عندلیبؔ و عدمؔ اور ساحرؔ بھی ہیں
ابرؔ و انورؔ، حفیظؔ اور عامرؔ بھی ہیں
صوفیؔ، سائبؔ، ظفرؔ بھی ہیں رطب اللساں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

ڈاکٹر عمیر منظر اس نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم ایک استاد شاعر ہیں۔ ان کے یہاں فنی خوبیاں بھی ہیں اور الفاظ وتراکیب کا بہترین استعمال بھی ہے۔ ان کی شاعری میں مقصدیت بھی ہے۔ ان کے یہاں غزلوں کے نام پر حرص وہوس نہیں ہے بلکہ کلام میں پاکیزگی ہے جو برجستہ اپنی جانب کھینچتی ہے۔ آپ کی اردو سے متعلق نظم دراصل ایک شاہکار ہے۔ ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ شاید کہیں اور یہ مثال نہ ملے کہ کسی شاعر نے اردو زبان کی شان میں ایسی نظم کہی ہو جس میں تین سو شعراء اور ادباء کے نام شامل ہوں۔ یہ بات بذات خود اس بات کی گواہ ہے کہ آپ کا مطالعہ وسیع اور وجدان قوی ہے۔ آپ کے یہاں نیرنگی ہے۔ وسیع القلبی ہے۔ جس طرح آپ نے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ شعرا کے ناموں کو مختلف بندوں میں پیوست کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ مسلم شعراء کے جتنے گرویدہ اور شیدا ہیں

اتنے ہی غیر مسلم شعراء کے بھی ہیں۔ آپ ان سے بھی اتنی ہی عقیدت رکھتے ہیں جتنی کہ مسلم شعراء سے اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ غیر مسلم اردو شعراء و ادباء نے اردو کے خزانے کو مالا مال کرنے میں بے حد گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی اس نظم میں حروف کی جو تکرار ہے وہ نظم کی خوبصورتی میں تو اضافہ کرتی ہی ہے اس کے وزن اور اس کی اہمیت کو بھی بڑھاتی ہے۔''

اسی طرح ایک دوسری نظم جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہے، جس کا عنوان ہے ''میرا وطن''۔ یہ نظم پندرہ بندوں پر مشتمل ہے اور اس میں بھی وہی خوبیاں ہیں جو اردو سے متعلق نظم میں ہیں۔ اس میں ہندوستان کی قدروں کا بھی ذکر ہے اور اس کی تاریخ بھی موجود ہے۔ مسجدوں کا جہاں تذکرہ ہے وہیں مندروں کا بھی بکھان ہے۔ اس ملک میں کچھ عناصر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کر کے میل جول اور پیار محبت کی فضا کو بگاڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن جب تک ایسے شاعر موجود ہیں یہ عناصر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس نظم میں مختلف شہروں کا بھی تذکرہ ہے اور اس کے قومی ورثے کو بھی گنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے ہی بند میں جہاں کوہ ہمالہ کا ذکر ہے وہیں اجنتا اور ایلورا کا بھی نام لیا گیا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو......

ہمالہ ہے اور رود گنگ و جمن ہے
اجنتا ایلورا ہے اور ان کا فن ہے
گلستاں ہے صحرا ہے دشت و دمن ہے
گل و لالہ ہے نرگس و نسترن ہے
یہاں جو بھی جنگل ہے مثل چمن ہے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے

یہ نظم فرقہ وارانہ یک جہتی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ کیونکہ اس میں شہروں اور مقامات کے ذکر میں نہ تو تعصب سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے اختلافی جذبے کو

داخل ہونے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس میں جہاں مدارس کا ذکر ہے وہیں ہندو وشو ودیالیہ کا بھی بیان ہے۔ اسی طرح جہاں جامع مسجد دہلی اور دوسری مسجدوں کا نام لیا گیا ہے وہیں اجودھیا کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کہ مندروں کا شہر ہے اور جسے رام کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔

یہاں پر ہے ناموس، بانگ اذاں ہے
یہاں پر اشوکا ہے، شاہ جہاں ہے
یہاں رام و راون کی اک داستاں ہے
زمانے میں مشہور ہندوستاں ہے
دُر بے بہا ہے یہ رشک چمن ہے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے

یہاں پرتھوی راج، محمود اعظم
یہاں اولیا صوفیا ہیں مکرم
یہ سنتوں کا، بھکتوں کا ہم راز و محرم
یہ ہے مندروں مسجدوں کا بھی سنگم
یہاں کوئی بت گر کوئی بت شکن ہے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے

یہاں پر ہے شام اودھ کا فسانہ
ہے صبح بنارس کا منظر سہانہ
اجودھیا کے مندر کا دلکش فسانہ
جہاں رام و لکشمن کا تھا اک زمانہ
یہاں مثل سیتا حیا کا چلن ہے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے

لیکن اسی کے ساتھ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا شکوہ بھی کیا گیا ہے اور پیار و محبت کی جگہ پر نفرت و کدورت پر اظہار افسوس بھی کیا گیا ہے۔

جناب ہما صدیقی کلام انجم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ان کے کلام میں نغمگی اور غنائیت کے پہلو بہ پہلو فکر و نظر کی ندرت اور لطافت کی بھی فراوانی ہوتی ہے۔ وہ شعر و سخن کی ہر صنف اور ہر بحر میں رواں دواں شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مخمس، مسدس غرض سب کچھ کہتے ہیں۔ وہ بڑے سلیقے اور روانی سے اپنا مافی الضمیر شعر میں ڈھال کر سامعین و قارئین تک اس طرح پہنچاتے ہیں کہ وہ فردوس گوش بن جاتا ہے۔ ان کا کلام خصوصی نوعیت کا حامل ہے پاکیزہ خیالات اور لطیف احساسات کا نتیجہ ہے کہ ان کا دل جتنا حساس ہے ان کا کلام اس سے زیادہ دلفریب ہے۔ ملاحظہ فرمائیے......

اک نیا عزم و یقیں لایا ہوں
جادۂ شوق میں سامانِ سفر لایا ہوں
نذر کرنے کے لئے حسن کی سرکار میں آج
دردِ دل خونِ جگر سوزِ جگر لایا ہوں

دیکھئے وہ کتنے ساز و سامان کے ساتھ سفر کا آغاز فرماتے ہیں اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر محبوب کے روبرو نذرانہ میں کیا کیا سوغات پیش کرتے ہیں۔ دردِ دل، خونِ جگر اور سوزِ جگر کے علاوہ اور کوئی سرمایہ عاشق نامراد کے پاس ہوتا ہی نہیں جو وہ حاضر کر سکے:

پہلی سی بات تو نہیں لیکن جفا تو ہے
ان کا کرم نہیں نہ ہو، میری وفا تو ہے

راہ و رسم محبت میں جب ناگواریاں پیش آتی ہیں تو از راہ غم خواری احباب ترک تعلق کا مشورہ دیتے ہیں کہ جب اُدھر سے نہ محبت کا اعتراف ہے نہ کوئی التفات تو بہتر ہے کہ اس سے صرفِ نظر کیا جائے۔ انجم صاحب کہتے ہیں کہ اے ناصح مشفق ہر چند پہلی

سی نگاہِ التفات نہیں مگر ادھر سے سلسلۂ جور و جفا جاری رہنا ہی تعلق خاطر کی دلیل ہے وہ اگر مائلِ کرم نہیں ہیں نہ سہی میری طرف سے تو وفا میں کمی نہیں۔ لہٰذا ترک تعلق کا کوئی جواز نہیں۔ یہ ہے استقامتِ محبت۔ اگلے شعر میں فرماتے ہیں......

یہ سوچ کر میں راہِ وفا میں چلا گیا
گو ہم سفر نہیں ہے مگر نقشِ پا تو ہے

راستہ کوئی بھی ہو اور سفر کہیں کا بھی ہو، تنہا روی میں خطرات مضمر ہیں اگر کوئی رفیقِ سفر مل جائے تو نہ صرف مشکلیں گھٹ جاتی ہیں بلکہ حوصلے اور ہمت میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ سفر آسان اور پُر لطف ہو جاتا ہے۔ انجم صاحب جب اس راہ پر تنہا ہی چل پڑے تو انھیں ہم سفر کی کمی کسی موقع پر محسوس ہوئی مگر ان کے عزم راسخ، پامردی اور جواں ہمتی نے اسے سنگِ راہ نہیں بننے دیا بلکہ بڑے تیکھے انداز میں خود کو سمجھاتے ہیں کہ نادان اگر کوئی شریک سفر نہیں تو غم کیا ہے رہبری اور رہنمائی کے لئے اگلوں کے نقوش قدم تو موجود ہیں۔ انہی پر چل کر منزل پانا یقینی ہے۔ کیسا حسین تخیل ہے اور کتنا دلکش حسن بیان ہے جو سالکین کے لئے بھی مشعل راہ ہے۔

اچھے شعر بغیر تشریح کے ہی دلنشیں ہو جاتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر بتایئے کہ کیا آپ کا ذوق شعریت دوسروں سے اس کی وضاحت طلب کرے گا یا خود آپ جو سمجھ رہے ہیں اسی میں لطف و کیف سمویا ہوا ہے......

بادۂ غم عمر بھر پیتے رہے
نام ان کا لے کے ہم جیتے رہے
زندگی میں کشمکش جاری رہی
ہم کبھی ہارے کبھی جیتے رہے

شاد ہوں درد عطا کر کہ دعا دے مجھ کو
دینے والے خوئے تسلیم و رضا دے مجھ کو

تیری نسبت سے پکاریں مجھے دنیا والے
تجھ پہ قربان کچھ ایسا ہی بنا دے مجھ کو

غم کی جب کوئی چاشنی نہ رہی
زندگی جیسے زندگی نہ رہی

اس مجموعے کی ابتدا جن تین نظموں سے ہوئی ہے وہ قابل مطالعہ ہیں اور شاعر کے جذب وشوق اور کرب واذیت کی بھی گواہ ہیں۔ایک کا عنوان ہے میرا وطن ،دوسری نظم ہے اردو زبان اور تیسری ہے میرا ہندوستان۔ یہ تینوں نظمیں بڑی پرتاثیر اور اثر انگیز ہیں۔ مجھے ان کا پورا کلام بے حد پسند ہے امید ہے کہ دوسرے قارئین بھی پسند کریں گے۔''

آزادی کے بعد ملک میں اہل وطن پر جو قیامتیں ٹوٹی ہیں ان کا ذکر ''میرا ہندوستان'' میں ہے اور اس پر اظہار تاسف کیا گیا ہے اور یہ سوال کیا گیا ہے کہ آخر آزاد ہندوستان میں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔عروس آزادی سے ہمکنار ہونے کے بعد شمع آزادی کے پروانوں پر کیا گزری ۔تعصب ،منافقت ،ناعاقبت اندیشی اور تنگ نظری نے کیا کیا ستم ڈھائے ،اس پر انجم کا طنز لطیف ایک مسدس کے دو بندوں میں ملاحظہ فرمایئے۔

راہزن کر رہے ہیں یہاں رہبری
ناسزاؤں کو حاصل ہوئی سروری
اہل دانش کو کرنی پڑی چاکری
جاہلوں کو روا دعویٰ داوری
الحذر الحذر الاماں الاماں
کیا یہی ہے یہی اپنا ہندوستاں

دین و ایماں کا جوہر یہاں لٹ گیا
لوگ دیکھا کیے کارواں لٹ گیا

عدل و انصافِ نوشیرواں لٹ گیا
باغباں چپ رہے گلستاں لٹ گیا
الحذر الحذر الاماں الاماں
کیا یہی ہے یہی اپنا ہندوستاں

''فریاد'' ان کی ایک حسین نظم ہے جس میں شر پسند عناصر کی چیرہ دستیوں سے دلوں میں جراحتوں کے چمن کھلے ہوئے ہیں جس میں وہ حکومت کے قول و فعل کے تضاد سے جو کرب محسوس کرتے ہیں طنز لطیف سے صاحبانِ اقتدار کو متوجہ کرتے ہیں......

ماحول ہے تاریک فضاؤں میں دھواں ہے
جس سمت نظر اٹھتی ہے وحشت کا سماں ہے
کہنے کے لئے آج ہیں آزاد یقیناً
لیکن جبیں پہ ثبت غلامی کا نشاں ہے
تم نے کیا شاہین کو پابندِ نشیمن
ڈنکا یہ بجاتے ہو یہاں امن و اماں ہے
یہ مشق ستم کس لئے اے بانی بیدرد
ہر لب پہ تشکر کی جگہ آہ و فغاں ہے
اب حقّ و صداقت کے علم دار وہی ہیں
حق بات کی تائید جنھیں بار گراں ہے

ایک اور نظم ''ہم نہیں سمجھے'' کے چند اشعار سماعت فرمائیے:

محبت اس قدر بدنام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
خلوص اہل دل ناکام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
قفس ہو آشیاں ہو انجمن ہو صحن گلشن ہو
بپا چاروں طرف کہرام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
محبت کا جو خوگر ہے صداقت جس کا شیوہ ہے

وہی دل موردِ دشنام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
نوازے جارہے ہیں عقل کے دشمن بہر صورت
جو مخلص ہے وہ زیردام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ہمیں نے ظلمتوں میں روشنی پھیلائی ہے انجم
ہماری شخصیت بدنام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ہندی اور اردو کی کشمکش کے بارے میں نشترِ رگِ جاں کی طرح انجم صاحب کا ایک دلکش قطعہ ملاحظہ فرمائیے......

ہو تہذیب مسلم سے دامن کشاں
کھٹکتی علی گڑھ کی ہے داستاں
چرن سنگھ سے اردو ہے یہ پوچھتی
کہو بندہ پرور میں جاؤں کہاں
جنم میں نے تو بھارت کے اندر لیا
مجھے کہہ رہے ہو بدیسی زباں

حامد الانصاری انجم کا مشاہدہ بڑا زبردست ہے۔ وہ ذاتی تجربات سے بھی گذرے ہیں اور مطالعہ کی میز پر بھی طویل وقت گذارا ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں ان تینوں چیزوں کی بحسن وخوبی آمیزش ہے۔ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو بہت ہی خالص اور غیر ملاوٹی شے وجود میں آتی ہے۔ اندیشے بھی جنم لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ امید ویقین کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں......

غلط انداز سے اے دل بہار آئی تو کیا ہوگا
چمن کے پتے پتے پر خزاں چھائی تو کیا ہوگا
بہارِ نو کے دھوکے اب نہ کھاؤ اے چمن والو

نہ آئی لالہ و گل پر جو رعنائی تو کیا ہوگا
عنادل ہیں نہ فصل گل چمن تاراج ہے جیسے
رہی یونہی خزاں کی کار فرمائی تو کیا ہوگا
سرِ بالیں ہمارے چارہ گر آئے تو ہیں لیکن
سوا اُن کے، کسی نے کی مسیحائی تو کیا ہوگا

لیکن اس کے باوجود وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور رفیقان چمن کو بھی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مایوس نہ ہوں نا امیدی کے بطن سے ہی امید کا لمحہ پیدا ہوتا ہے۔ گھنگھور تاریکی کے شکم سے ہی روشنی کی کرن پھوٹتی اور غم والم کے طوفان بلا خیز کے دامن سے ہی آسودگی اور راحت جنم لیتی ہے۔ لہذا اس کی فکر نہ کرو کہ چمن کے پتے پتے پر خزاں چھائی ہوئی ہے بلکہ اس امید کے ساتھ سیر چمن کیا کرو کہ بہار کا بھی زمانہ آئے گا اور خزاں منہ چھپاتی پھرے گی۔ اس لیے گلستاں کے نظاروں سے خوب لطف اندوزی کرو۔

چمن سے، چمن کی بہاروں سے کھیلو
گل و یاسمن، لالہ زاروں سے کھیلو

مرے ہم نشینو نظاروں سے کھیلو
مہہ و کہکشاں سے ، ستاروں سے کھیلو

تمہیں دستِ قدرت نے سانچے میں ڈھالا
مشیت کے رنگیں اشاروں سے کھیلو

زمیں بھی تمہاری فلک بھی تمہارا
شب و روز کے شاہکاروں سے کھیلو

خزاں تم سے دامن بچا کر چلے گی
چلو صحن گلشن سے ، خاروں سے کھیلو

ہے سارا گلستاں نشیمن تمہارا
نشیمن کی خاطر شراروں سے کھیلو

سفینے کے مالک ہو ساحل پہ بیٹھے
اٹھو موج و طوفاں کے دھاروں سے کھیلو

تمہارے قدم خود ہی چومے گی منزل
بڑھو تو سہی ریگزاروں سے کھیلو

ان کی شاعری میں جگہ جگہ امیدوں کے گل و بلبل نے نوازی کرتے نظر آتے ہیں۔ ناامیدی اور مایوسی کو انہوں نے اپنے دامن سے جھٹک دیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مایوس اور ناامید شخص نہ تو اپنی زندگی میں خوشیاں لاسکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کی زندگی میں۔ دنیا میں وہی کامیاب و کامراں ہوسکتا ہے جو حادثات و غم و آلام سے نبرد آزما ہوتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتا چلا جائے۔ ایسے راہرو کی راہ میں لاکھوں مصیبتیں کیوں نہ آئیں وہ ان کو انگیز کرتا اور صبر و برداشت کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حالات بھی اسی کا ساتھ دیتے ہیں اور منزلیں بھی اسی کے قدم چومتی ہیں۔ جو شخص حوادث زمانہ سے گھبرا کر بیٹھ جائے وہ منزل مراد تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ لہٰذا امیدوں کے چراغ روشن کر کے اور عزم و حوصلے کو اپنا رفیق سفر بنا کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر انجم کے کلام سے یہی پیغام ملتا ہے۔ وہ اسی کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ ایمان ہے کہ اگر حسرت دیدار کمال اشتیاق کا درجہ حاصل کرلے تو بے نور آنکھیں بھی چشم بینا میں بدل سکتی ہیں اور بصارت کھو جانے کے باوجود بصیرتوں کے چراغ روشن ہوسکتے ہیں۔ ایسی بصیرتیں جو چشم بینا سے محروم شخص کو موسیٰ کلیم بنا سکتی ہیں۔ آپ کی ایک نظم کا عنوان ہے ''کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے'' یہ نظم اپنے آپ میں ایک بانگ جرس ہے، ایک صور اسرافیل ہے، ایک نغمہ حدی ہے اور ایک نقارہ بیداری ہے۔

بہت ہی آسان زبان میں اور سہل ممتنع میں انہوں نے رفیقان چمن کو آواز دی ہے۔ زبان بے حد سادہ اور سہل ہے اور ہر شخص نظم کے پیغام کو آسانی سے سمجھ سکتا اور اپنے دل میں اتار سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس نظم کے چند اشعار......

حریم قلب میں رقصاں جمال یار ہوجائے
اگر پیدا کمالِ حسرت دیدار ہوجائے
غم دوراں غم جاناں ہی سے آباد ہے دنیا
نہ ہو یہ سازوساماں زندگی دشوار ہوجائے
بہار نو کے جھرمٹ میں نسیم صبح آتی ہے
یہ کہہ دو سبزۂ پامال سے بیدار ہوجائے
بہارو سازِ نو پر چھیڑ دو ایسا کوئی نغمہ
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہوجائے
کرے ہی اس کا استقبال منزل دو قدم بڑھ کر
کوئی گھر سے نکلنے کو اگر تیار ہوجائے
خدا پر ناخدا کا ہو بھروسہ پھر تو کیا کہنا
وفور موج و طوفاں سے سفینہ پار ہوجائے
خلوص و صدق ہو عزم و یقیں ہو سوز کامل ہو
عجب کیا ہے وہ انساں قوم کا سردار ہوجائے

لیکن اس کے ساتھ ارباب اختیار سے شکوہ بھی ہے۔ غم روزگار سے تو نہیں ہاں ذمہ داران غم روزگار سے شکایت ضرور ہے۔ لیکن یہ شکایت بھی محبت آمیز ہے۔ نفرت وکدورت کا دور دور تک شائبہ بھی نہیں ہے۔ ہاں لوگوں کی بے حسی پر افسوس ضرور ہے۔ یہ صورت حال صرف کسی ایک طرف نہیں بلکہ ہر طرف ہے۔ جسے ہم اپنا سمجھتے ہیں وہ بھی جانے انجانے میں تکلیف کا باعث بن رہے ہیں اور جو غیر ہیں وہ بھی سامان اذیت پیدا کر رہے ہیں۔ لہذا شاعر نے ان حالات پر اظہار افسوس بھی کیا ہے لیکن یہ امید بھی باندھ رکھی ہے کہ یہ حالات ہمیشہ نہیں رہیں گے......

زوالِ اوج انسانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
ضیاء حسن ایمانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
کمال فتنہ سامانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
قیامت کی پریشانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
حماقت اور نادانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
جہالت کی فروانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
خزاں نے لوٹ لی ہے آبروئے گلشنِ ہستی
گلوں کی چاک دامانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
عروسِ لالہ و گل پر نہیں پہلی سی شادابی
بہارِ نو کی ویرانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
نرالے کارنامے دورِ حاضر کے نمایاں ہیں
نگاہ و دل کی حیرانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
نہ اخلاق و مروّت ہے محبت ہے نہ شفقت ہے
تغافل کی رجز خوانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
محبت ہے نہ الفت ہے فقط اک اجنبیت ہے
ہر اک تصویرِ انجانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
عداوت بغض و کینہ ہے حسد ہے، ترش روئی ہے
دلوں کی تنگ دامانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
نہیں ہے کوئی شئے محفوظ اے دل اس زمانے میں
ہر اک سو قتل انسانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
یہی بس دیکھتا ہوں روز و شب صبح و مسا ہر جا
ستم گر کی ستم رانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے
نہ پوچھو نبضِ دوراں اور رفتار جہاں انجم
زمانے کی پریشانی اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

غرضیکہ ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کی شاعری امید و یقین کی پختگی سے عبارت ہے۔ مایوسی اور نامرادی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ حالات سے مقابلے کی ترغیب اور میدان کارزار میں بے خطر کود پڑنے کی تحریک ہے۔ خواہ آتش نمرود میں جست لگانی ہو یا طوفانوں کا سینہ چیرنا ہو، ہر مرض کی دوا ان کے کلام میں موجود ہے۔ دراصل آپ کی شاعری کی ابتدا ہی جوش و ولولہ اور امید و یقین سے ہوتی ہے جب آپ نے اپنے ابتدائی ایام ہی میں ''وقت کی پکار'' نامی نظم لکھی تھی۔ وہ نظم آپ کی شاعری کی ایک زندہ عبارت ہے اور کتاب شاعری کی ایک بھرپور تمہید ہے۔ دلوں میں گرمی پیدا کرنا آپ کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ ایسی گرمی جو صرف خرافات کو خاکستر کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مدھم مدھم سی آگ جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بادصبا کا خرام ناز قارئین کو فرحت وانبساط سے ہمکنار کرتا ہے۔ لیکن یہ بادصبا جلتی ہوئی مدھم سی آگ کو بجھاتی نہیں بلکہ اس کو اور ہوا دیتی ہے لیکن اتنی بھی ہوا نہیں دیتی کہ وہ آگ شعلہ میں تبدیل ہو جائے۔ بلکہ اسے صرف اس قدر زندہ رکھتی ہے کہ شاعر کے دل کی گرمی باقی رہے اور وہ دوسروں کو بھی اس کی آنچ سے لطف اندوز کرتا رہے، دلوں میں حرارت پیدا کرتا رہے۔

اگر ڈاکٹر حامد الانصاری انجم نے غزلوں اور نظموں کی طرف خصوصی توجہ دی ہوتی تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ملک کے صف اول کے شاعروں میں شمار ہوتے اور اردو شاعری کے خزانے میں ان کا کلام ایک قیمتی اثاثہ تصور کیا جاتا۔ چونکہ وہ دہلی، لکھنؤ یا ایسے کسی بھی ادبی مرکز سے دور رہے اور اسلامی شاعری اور اسلامی ماحول سازی کو ہی انہوں نے اپنا مشن بنا رکھا تھا اس لیے غیر نعتیہ شاعری کی طرف ان کی توجہ کم رہی۔ ادبی مراکز سے دوری کی وجہ سے ہی نقادوں کی نظر آپ کی شاعری پر کم کم ہی گئی ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کا کلام اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

○○

صحافتی خدمات

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم ایک بے باک، بے خوف، بے لاگ اور خوددار صحافی بھی ہیں۔اس کے گواہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل وجرائد ہیں۔ دوران طالب علمی سے ہی ان کے اندر صحافت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ معاشرے میں پنپنے والی برائیوں اور سماجی خرابیوں کو جہاں دوسرے بہت سے طریقوں سے دور کیا جاسکتا ہے وہیں صحافت کے ذریعے بھی ان برائیوں کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس راز سے آگاہ تھے کہ ایک صحافی معاشرے کے جسم پر موجود زخموں پر نشتر زنی بہتر انداز میں کرسکتا ہے۔ جس طرح کپڑے پر آئی شکن کو گرم پریس سے دور کیا جاتا ہے اسی طرح روح کی شکنوں کو اخبارات ورسائل کے صفحات پر حدت اور شدت سے بھرپور تحریروں سے بھی دور کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ قلم ایک ایسی طاقت ہے جو کسی کے آگے نہیں جھکتی اور قلم سے بڑے بڑے معرکے سر کیے جاسکتے ہیں۔قدرت نے ان کو جہاں شاعرانہ مزاج دیا ہے وہیں انہیں اثر انگیز تحریریں لکھنے کا بھی ملکہ حاصل ہے۔ ان کا قلم جب کسی موضوع پر اٹھتا ہے تو اس کے تمام تر پہلوؤں کا اس انداز میں جائزہ لیتا ہے کہ اس کا قاری پر ایک اچھا اثر پڑتا ہے۔

آپ صحافت میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے قلم اور فکر کے شیدائی ہیں۔ اسی لیے جب اپنا پہلا جریدہ شروع کیا تو اس کا نام مولانا آزاد کے پہلے اخبار ''الہلال'' کے نام پر رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ مولانا آزادؒ کا الہلال جہاں انگریزوں کے ظلم وجبر کی وجہ سے بند ہوگیا وہیں ڈاکٹر انجم کا الہلال اقتصادی مسائل اور

مالی دشواریوں کو برداشت نہیں کرسکا اور بالآخر اس نے بھی جلد ہی اپنی آخری سانس پوری کرلی۔ اس کے بعد انھوں نے دو ماہی خبرنامہ جاری کیا۔ وہ بھی چند سال نکلنے کے بعد بند ہوگیا۔ ایک تیسرا رسالہ بھی جاری کیا گیا جس کا نام ''المؤتمر'' تھا مگر وہ بھی اس جہان رنگ وبو میں زیادہ دنوں تک اپنی خوشبو نہیں بکھیر سکا اور اسے بھی الہلال اور خبرنامہ کے حشر سے دوچار ہونا پڑا۔

آپ مولانا آزادؒ کے بعد جس دوسرے صحافی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ مولانا محمد عثمان فارقلیطؒ کی شخصیت ہے۔ ان دونوں سے آپ کو بہت عقیدت ہے اور جب بھی ان کا تذکرہ کرتے ہیں والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ کی تحریریں ملک کے اخبارات ورسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔ اس وقت انھوں نے معروف صحافی اور قلم کار مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی کو اپنا استاد بنایا تھا اور ان سے اپنے مضامین پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن جب مدرسہ ریاض العلوم دہلی سے فراغت اور اس کے بعد قرول باغ میں واقع طبیہ کالج سے تکمیل الطب کی ڈگری لینے کے بعد جب انھوں نے اپنے وطن مالوف، اس وقت کے ضلع بستی اور موجودہ سنت کبیر نگر کے قصبہ لوہرسن بازار سے الہلال شروع کیا تو ان کی تحریریں اس بات کی گواہی دینے لگیں کہ اب وہ میدان صحافت کے ایک بہترین شہسوار بن چکے ہیں۔

آپ ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں اور آپ کی تحریروں میں زبان کی چاشنی قارئین کو اپنا دیوانہ بنادیتی ہے۔ تحریروں میں مترادفات کے موتی اس قدر پیوست ہوتے ہیں کہ وہ مضمون کی جان بن جاتے ہیں۔ ماہنامہ الہلال شروع کرنے میں آپ کو بہت دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ یہ ساٹھ کی دہائی کا عرصہ تھا اور تقسیم وطن کی یادیں اب بھی لوگوں کے دلوں میں باقی تھیں۔ اس لئے جب انھوں نے الہلال کے رجسٹریشن کی کوشش شروع کی تو انھیں بہت ہی صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور رجسٹریشن حاصل کرکے چھوڑا۔ اس سلسلے میں مصنف ''نقوش جاوداں'' ڈاکٹر شمس کمال لکھتے ہیں......

''آپ نے طبیہ کالج میں حصول تعلیم کے دوران معروف صحافی اور قلم کار حضرت مولانا سید تقریظ احمد سہوانی سے رابطہ قائم کیا۔ موصوف باڑہ ہندو راؤ صدر بازار دہلی سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ اخبار اہلحدیث کے مدیر مسئول تھے انہوں نے والد صاحب کومضمون نگاری کی مشق کرائی اوراپنے تجربات کی روشنی میں انہیں صحافت کی ابجدیات سے واقف کرایااور میدان صحافت میں چلنے کے گر سکھائے۔ ایک بار سہوانی صاحب نے کسی خاص موضوع پر مضمون لکھنے کا حکم دیا تو وہ بڑے پس وپیش میں پڑ گئے۔ تاہم انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے ایک مضمون لکھ کر موصوف کی خدمت میں حاضر کیا۔ اس کی نوک پلک درست کر کے مولانا نے ''یہ ہے اردو زباں'' کے عنوان سے شائع کردیا۔ وہ مضمون ان کے لیے مہمیز ثابت ہوا اور مولانا مرحوم کی تربیت میں اس میدان میں وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔

جب آپ وطن واپس آئے تو شوق صحافت نے ایک میگزین نکالنے پر مجبور کردیا۔ نہ سرمایہ، نہ سرپرست، صرف اپنے شوق کے سہارے آپ نے ''الہلال'' کے عنوان سے ایک ماہنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ماہنامے کا رجسٹریشن کرانے کے لیے آپ نے بڑے پاپڑ بیلے۔ کوئی اور ہوتا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتا مگر شوق صحافت تھا کہ اس وادیٔ سنگلاخ کی طرف محوسفر ہونے پر مجبور کیے ہوئے تھا۔ آپ کے عزم جواں اور شوق صحافت نے ہار نہیں مانی اور بانسی کے مشہور وکیل جناب سلیمان ادہمی اور معروف شخصیت قاضی عدیل عباسی ایم ایل اے کی مدد اور توسط سے آپ نے تمام قانونی موانعات اور دشواریوں کو حل کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء کا سال نوطلوع ہوتے ہوتے ''الہلال'' کا پہلا شمارہ لوہرسن بازار کے آسمان صحافت سے الہلال بن کر طلوع ہوگیا''۔

پہلے شمارے کے قلمکاروں میں مولانا علی میاں ندوی، مولانا مشیر الحق بحری آبادی، مولانا تاج الدین رام نگری، مولانا عارف سراجی، جناب شبنم ریاضی (آپ کا استعاراتی نام) حیرت بستوی اور ڈاکٹر انجم جمال اثری قابل ذکر ہیں۔ یہ شمارہ سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔

''حرف آغاز'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں آپ نے اس رسالے کی دس غرض وغایت اور اہداف ومقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے......

۱۔ الہلال کتاب وسنت کا بے باک علم بردار، ملت اسلامیہ کا عظیم المرتبت داعی، امت مسلمہ کا بے مثال سچا رہنما ہوگا۔

۲۔ الہلال علوم اسلامی کا حامل، شریعت حقہ کا پیغامبر اور احکامات دین کا ناشر ہوگا۔

۳۔ الہلال دینیات، سیاسیات، اخلاقیات واقتصادیات اور معیشت ومعاشرت کا بہترین معلم ہوگا۔

۴۔ الہلال اسلامی انقلاب کا امام ہوگا۔ احقاق حق اور ابطال باطل اس کا فرض اولین ہوگا۔

۵۔ الہلال الحاد ولادینیت، کفر وظلمت اور شرک وبدعت کے خلاف محاذ آرائی کرے گا۔

۶۔ الہلال عالم اسلام کا عموماً اور ساڑھے چار کروڑ ہندی مسلمانوں کا خصوصاً صحیح اور سچا ترجمان ہوگا۔

۷۔ الہلال اسلامی زندگی کے نقوش کو اجاگر کرے گا اور مخالفین اسلام کا دنداں شکن جواب دے گا۔

۸۔ الہلال درد واضطراب میں ڈوبی ہوئی دنیا کو امن وسکون اور چین واطمینان کی زندگی عطا کرے گا۔

۹۔ الہلال کاروان انسانیت کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے مینار روشنی، مشعل راہ اور سنگ میل کا کام دے گا۔

۱۰۔ ہندی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور جملہ ترقیات کے لیے ہر امکانی جد و جہد اور کوشش کرے گا۔

اس کے بعد صحافت کی راہ میں حائل ہونے والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اپنی ہمت مردانہ اور عزم راسخ کا اعلان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لاکھ دشواریاں ہماری راہ میں حائل ہوں مگر ہم الہلال کی روشنی سے سارے جہاں کو منور کر کے ہی رہیں گے لیکن اس کے لیے قارئین الہلال کا تعاون از حد ضروری ہے کہ اللہ رب العالمین کی توفیق کے بعد قارئین کے تعاون کے سہارے ہی الہلال بدر منیر بن سکتا ہے......

"حاصل کلام یہ کہ الہلال کے سامنے بھی یہ موجودہ مشکلات و موانعات اور صعوبات راہ پیش نظر تھیں۔ ماحول کی ناسازگاری اور ناقدری زمانہ کا احساس تھا، حوادث روزگار اور مالی حالت کی کمزوری کا کما حقہ خیال تھا مگر باوجود اس کے الہلال کے اجرا کا اعلان کیا گیا اور سوچ سمجھ کر جرات مندانہ اعلان کیا گیا اور اب بھی ادارہ متوکلاً علی اللہ عزم بالجزم کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم ناسازگار ماحول، ناموافق فضا، نامساعد حالات سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہی رہیں گے اور چلتے ہی رہیں گے۔ ہمارا عزم راسخ ہے، ہمارا یقین محکم ہے، خدا پر بھروسہ ہمارا عین ایمان ہے۔ استقلال ہمارا یقین ہے، ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ ضرور وہ دن آئے گا جب ناکامی کو شکست فاش ہوگی، کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور فائز المرامی ہمارا استقبال کرے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ آخر میں ہم ان اسلام نواز بزرگوں اور دین پرست دوستوں سے گزارش کریں گے کہ جن کے سینوں میں دل اور دلوں میں اسلامی درد اور ایمانی جذبہ، دین کی تڑپ، خدمت خلق کا جوش و حوصلہ ہے وہ الہلال کو واقعتاً آسمان صحافت کا نجم درخشاں، بدر منیر اور آفتاب نصف النہار بنا کر اسلام دوستی اور دینداری کا ثبوت دیں۔ چونکہ خدا کی رحمت و عنایت، اس کے فضل

وکرم اور اس کی مہربانیوں کے بعد ہمیں آپ کے دست تعاون کی بھی ضرورت ہے لہذا آپ حضرات سے ہم مخلصانہ درخواست کریں گے کہ حتی الوسع ہماری دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی امداد واعانت فرما کر عنداللہ وعندالناس ماجور ہوں۔''

دنیائے صحافت کے اتار چڑھاؤ اور زمانے کے مدوجزر پر ان کی گہری نظر تھی اور انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اخبار نکالنا تو آسان ہے لیکن اسے جاری رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر احباب اور اردو قارئین کی جانب سے حوصلہ افزائی نہیں ہوگی تو اسے جاری رکھنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ بہت سے اخبارات ورسائل نے جنم لیا، کچھ دنوں تک وہ اپنا جلوہ بکھیرتے رہے اور بالآخر گردش لیل ونہار کے شکار ہو گئے۔ اسی لیے وہ پہلے شمارے ہی میں اس جانب اشارہ کر دیتے ہیں اور لکھتے ہیں......

''دنیائے صحافت میں جانے کتنے اخبارات ورسائل معرض وجود میں آئے اور ختم ہو گئے۔ جانے کتنے اور بھی منظر عام پر جلوہ گر ہوں گے اور آغوش فنا میں سو جائیں گے۔ ہمارے سامنے بہت سے ایسے رسالے اور اخبارات ہیں جو مطلع صحافت پر جلوہ فگن ہوئے جن کے جاری کرنے والوں نے بڑی شان وشوکت اور اولو العزمی کے ساتھ جاری رکھنے کا اعلان کیا تھا، ناسازگاری ماحول اور حوادث روزگار سے مقابلہ کرنے کا دعوا کیا تھا، ہر قسم کی مشکلات اور دشواریوں سے ٹکرانے کا عزم بالجزم کیا تھا۔ لیکن آج ان میں سے بہتوں کا وجود بھی باقی نہیں ہے۔''

پھر وہ اس کے اسباب کو تلاش کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب بھی دیتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اختصار کے ساتھ بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے عوام وخواص اور اہل

اردو کی عدم توجہی، بے اعتنائی اور ناقدری اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ہمارے عوام میں ابھی زبان کے تئیں بیداری نہیں آئی ہے۔ ان میں علم کی بھی بڑی کمی ہے۔ صحافت کا ذوق ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ دین ومذہب سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔۔۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کی حریصانہ نگاہوں میں صرف دنیا ہے اور کچھ نہیں۔۔۔ اب ایسے عالم میں ہمت وجرأت کر کے کوئی شخص کسی اخبار کے اجراء کا قدم اٹھاتا ہے تو گویا وہ مصائب وآلام سے دوچار ہونے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ حوادثات روزگار اور ہجوم افکار وآلام کو دعوت دیتا ہے۔ اپنے سکون واطمینان کے کارواں کو فنا کی نذر کرتا ہے۔ اپنے سفینہ حیات کی بربادی کے لیے ہلاکت خیز طوفانی موجوں کو للکارتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایسے حالات میں کوئی اخبار یا رسالہ زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ اس کا فنا ہونا یقینی ہے۔۔۔ آپ سوال کریں گے کہ پھر الہلال کا اجراء کیوں؟ تو ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ الہلال اور دیگر اخبارات میں فرق ہے اور بہت فرق ہے۔ الحمد للہ یہ اخبار تجارتی مقاصد کے تحت جاری نہیں کیا گیا ہے۔ یہ صرف اور صرف دین وملت اور قوم وملک کی اصلاح وتبلیغ اور خدمت تعلیم کے مقدس جذبے کے تحت شروع کیا گیا ہے۔ جہالت وضلالت کے تیرہ وتاریک ماحول کو اسلامی علوم وافکار اور خیالات کے پرانوار جلووں سے منور کرنے کے جذبے کے تحت شروع کیا گیا ہے''۔

ان کی نظر عالمی حالات پر بھی ہے اور ملکی حالات پر بھی۔ انہوں نے اندرون ملک ظلم وجبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بیرون ملک میں ہو رہی زیادتیوں پر بھی اظہار تشویش کیا ہے۔ عالمی حالات پر ان کی نظر کس قدر ہے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمانوں پر ہو رہے ظلم وجبر کے خلاف انہوں نے کس طرح آواز بلند کی اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے......

''مختلف ذرائع ابلاغ کے مطابق مسلمان بوسنیا، برما، روس، فلسطین اور دیگر متعدد ملکوں میں معاندین اسلام اور مخالفین دین کے ہاتھوں ظلم و جبر کی چکی میں پس رہے ہیں۔ لٹ رہے ہیں، پٹ رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، بے عزت ہو رہے ہیں، بے گھر اور بے وطن ہو رہے ہیں، ان کی مسجدوں اور درسگاہوں کو منہدم کیا جا رہا ہے، نمازیوں کو بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔۔۔اطلاعات کے مطابق صرف بوسنیا میں ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا جا چکا ہے۔ سیکڑوں مسجدوں کو زمین بوس کر کے سنیما گھروں اور قبرستانوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے، ہزاروں مسلمانوں کو بے وطن ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔۔۔دنیا کے مختلف ممالک میں مسلمانوں کی زبوں حالی، کس مپرسی، بے کسی اور بے بسی، بے خبری اور بے توجہی، بے اعتنائی اور بے چارگی کو دیکھ کر بے اختیارانہ زبان پر آجاتا ہے۔۔یااللہ! آج کے مسلمان کیسے ہیں، ان کی غیرت ایمانی کو کیا ہو گیا ہے، ان کا جذبہ اسلامی کیوں سرد پڑ گیا ہے؟'' اس کے بعد عالم اسلام کی خاموشی پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں ''اس ظلم و جبر پر عالم اسلام کیوں خاموش ہے، سب کی زبانیں کیوں گنگ ہیں، سب کے کان کیوں بہرے ہیں، سب کے حواس خمسہ کیوں معطل ہو چکے ہیں؟''

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی نگاہ سیاسی امور پر بھی ہے اور وہ سیاسی حالات و واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر ان پر بڑے ہی نپے تلے انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کے سیاسی مضامین اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کی انگلی زمانے کی نبض پر ہے اور وہ بہت ہی مفکرانہ انداز میں ایک ایک بات کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے ''خبرنامہ'' کے ایک شمارے میں اپنے خصوصی تجزیہ میں دسویں عام انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے سیاسی جماعتوں کی ہنگامہ آرائی کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ وہ انہیں اپنے مضمون کے بین السطور میں یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہیں ان حرکتوں سے باز آجانا چاہیے کیونکہ یہ نہ تو ملک کے مفاد میں ہیں اور نہ ہی خود ان کے مفاد میں۔ ''الیکشن کا طوفان'' کے عنوان سے وہ رقم طراز ہیں......

''ہمارے ملک میں دسویں پارلیمانی انتخابات کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ انتخابی

پارٹیاں خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اتر آئی ہیں۔ ہر پارٹی نے ملک کے تخت وتاج کے لیے پوری قوت جھونک دی ہے۔ حسب حیثیت سبھی اپنے اپنے پرچار کی آندھی اٹھا رہے ہیں۔ سیاسی پہلوان عجیب وغریب کرتب دکھا کر انتخابی میدان کو سر کرنے کے لیے جسم وجان کی تمام توانائی صرف کر رہے ہیں۔ عوام کا رخ اپنی جانب موڑنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف الزام، اتہام، دشنام طرازی کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں۔ نہ تو کوئی لیڈر کسی کو خاطر میں لا رہا ہے نہ کوئی پارٹی۔ غرضیکہ پورے ملک میں ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ کتنے امیدوار جان سے مار دیے گئے ہیں اور کتنے ووٹر فنا کے گھاٹ اتار دیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ دہشت گردوں نے اپنی ہٹ لسٹ پر عمل شروع کر دیا ہے۔ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کا قتل بھی کیا جا چکا ہے۔ راجیو گاندھی کا قتل بھارت ورش کی مقدس پیشانی پر ایک ایسا گھناؤنا داغ ہے جسے کسی بھی حال میں صاف نہیں کیا جا سکتا"۔

ایک دوسرے مضمون میں آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی زیادتیوں پر اظہار افسوس کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے ہی ملک کی آزادی کی جنگ شروع کی تھی اور انہوں نے ہی اس آگ کو بھڑکایا تھا جو آگے چل کر آزادی کا شعلہ جوالہ بن گئی۔ لیکن جب بھی مجاہدین آزادی کا ذکر ہوتا ہے تو مسلمانوں کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ انہیں بھلا دیا جاتا ہے اور محض چند ناموں کے علاوہ اور کسی کا نہ تو نام لیا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی قربانیوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال نہ تو ملک کے لیے اچھی ہے اور نہ ہی اہل وطن کے لیے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ایک طبقہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کو تاریخ کے صفحات سے مٹا دینے پر تلا ہوا ہے۔ اس بارے میں اظہار افسوس کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں......

"اس ملک کو اتفاق واتحاد اور یک جہتی کی طاقت ہم نے بخشی ہے۔ انداز

گویائی اور طرز جہاں بانی کا سبق ہم نے پڑھایا ہے۔ اس ملک کو غلامی کی دلدل سے ہم نے نکالا ہے۔ اہل وطن کے گلے سے طوق غلامی ہم نے اتارا ہے۔ جنگ آزادی کی قیادت ہم نے کی ہے۔ دشمنوں کو شکست فاش ہم نے دی ہے۔ لیلائے آزادی کے عشق میں دار و رسن کا استقبال ہم نے کیا ہے۔ کالا پانی کی سزا ہم نے جھیلی ہے۔ احمد نگر اور دوسرے شہروں کی جیلوں کو ہم نے آباد کیا ہے۔ ظالم انگریزوں کی ہیبت ناک عدالتوں میں ہم نے بے خوف وخطر مجاہدانہ کردار پیش کیا ہے۔ فرنگی جابروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کو خوش آمدید ہم نے کہا ہے۔ اپنے ہی قتل کے محضر نامے پر دستخط ہم نے کیے ہیں۔ اس کے باوجود ہم سے یہ گلہ ہے کہ ہم وفادار نہیں''۔

وہ مسلمانوں کی بے حسی اور دین سے بے رغبتی پر ان کو بیدار کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور انہیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ انہیں اپنے مذہب کا پیرو ہونا چاہیے، اپنے اسلاف کی قربانیوں کو یاد رکھنا چاہیے اور اپنے اسلامی تشخص کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیے۔ وہ انگریزی کے نئے سال کی آمد پر مسلمانوں کے ذریعے جوش وخروش کے مظاہرے پر اظہار افسوس کرتے ہیں اور انہیں یاد دلاتے ہیں کہ ان کے اسلامی سال کا مہینہ محرم ہے۔ اس بارے میں ایک مضمون میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں......

''اسلامی سال کے اولین مہینے کا انتخاب بڑے غور وفکر کے بعد ہوا ہے۔ اس کے وجود میں اسلامی جذبات واحساسات کی گہرائی وگیرائی نظر آئے گی۔ یہ دیگر مذاہب کے مہینے کی مانند نہیں ہے کہ اس کے آغاز وانجام پر بے ہنگم خوشیوں اور غموں کا مظاہرہ کیجیے۔ اسلامی مہینے کی ایک مقدس تاریخ ہے۔ ایک عجیب وغریب دور سے اس کی نسبت ہے۔ اس کے پس منظر پر اگر غور کیا جائے تو یہ نرالا مہینہ معلوم ہوگا۔ اس کی جدت وندرت کا احساس ہوگا۔ تاریخ عالم کے ماہ وسال میں یہ ممتاز ومنفرد اور بے مثال وبے نظیر ہوگا۔ اگر

اس کے تقاضوں کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ملت اسلامیہ کا دور انحطاط یک لخت ختم ہو جائے گا۔''

ماہنامہ ''الہلال'' کے اکتوبر نومبر ۱۹۵۷ کے مشترکہ شمارے میں جہاں بہت سے متنوع موضوعات پر مضامین ہیں وہیں ہندوستان میں اردو زبان کے ساتھ ہو رہی ناانصافی پر بھی ایک بھرپور مضمون شامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مدیر الہلال کو اردو زبان کی زبوں حالی پر کس قدر رنج ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے اور اس کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں کا ازالہ کیا جائے۔ اس وقت کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں ایکس لاکھ دستخطوں کے ساتھ جو عرضداشت پیش کی گئی تھی اس کے حوالے سے بھی گزارشات کی گئی ہیں۔ مضمون میں اس بات پر اظہار مسرت کیا گیا ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے بلا لحاظ مسلک و مذہب تمام اردو والے متحد ہیں۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات کی شمولیت اس لیے ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ اردو کے سلسلے میں کوئی بہت زیادہ پیشرفت نہیں ہوئی ہے اور آزادی کے بعد سے آج تک اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس زبان کو اس کا اصل مرتبہ حاصل نہیں ہو پایا ہے۔ پیش ہے ایک اقتباس......

''آزاد ہندوستان میں اردو زبان کا جو حشر ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ برسوں کی جدوجہد اور کوششوں کے باوجود بے چاری اردو کو اس کا جائز حق نہیں مل پا رہا ہے۔ آج اس کو مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اس کی صورت مسخ کرنے کے لیے پوری قوت صرف کی جا رہی ہے۔ محبان اردو اسے زندہ رکھنے کی ہر ممکن جدوجہد کر رہے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ اردو کو بچانے کی خاطر ایکس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک عرضداشت صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد جی کی خدمت میں پیش کر کے اردو کا مقدمہ داخل کیا گیا ہے۔ اس بارے میں فیصلہ چاہا گیا ہے کہ اردو کو اس کا حق دیا جائے لیکن تعجب ہے کہ اس بارے میں ابھی تک کوئی عملی قدم نہیں

اٹھایا گیا۔ محبان اردو نے متعدد مرتبہ صدر محترم کے باب عالی پر دستک دی ہے لیکن کوئی جواب نہیں ملتا: رموز مملکت خویش خسرواں دانند ___ ابھی کل کی بات ہے اردو نوازوں نے ملک بھر میں جگہ جگہ یوم اردو منا کر ایوان حکومت میں پھر اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی اور اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی درخواست کی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس بارے میں تمام اردو والے بلا لحاظ مسلک و مذہب کوشش کر رہے ہیں اور سبھی اس جدوجہد میں شامل ہیں۔ تمام برادران وطن نے بیک وقت اپنی آواز ایوان حکومت میں پہنچا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو تحریک ہرگز ہرگز فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ صرف مسلمانوں کی متاع عزیز ہے ___ ہم اردو دوستوں سے التماس کریں گے کہ وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ اپنی جدوجہد اور کوشش جاری رکھیں۔ جب حکومت ہند نے اردو کو ملک کی ایک زبان تسلیم کیا ہے تو دیر یا سویر اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہو کر رہے گا''۔

خبرنامہ کا ایک شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۹۰ اور جنوری ۱۹۹۱ پر مشتمل ہے۔ اس شمارے کا اداریہ ''احساسات'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب عراق اور کویت کا مسئلہ درپیش تھا اس لیے یہ اداریہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔ اس وقت ''ٹیپو سلطان'' نامی سیریل کافی مقبول ہو رہا تھا۔ شہروں کو چھوڑیئے دیہاتوں میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنی جا رہی تھی۔ لوگ اجتماعی طور سے اس سیریل کے دیکھنے کا اہتمام کرنے لگے تھے۔ اس سیریل کو اسلامیانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ شیر میسور کی حیات اور کارناموں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے ''ہماری مجلس'' کے تحت ٹی وی سیریلوں کے دیکھنے کی شرعی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''بزم قارئین'' کے تحت خبرنامے کے بارے میں قارئین کی آراء درج کی گئی ہیں۔ رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ممبر، نیپال کی مشہور و معروف تعلیمی درسگاہ جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر کے ناظم اعلیٰ خطیب الاسلام حضرت

مولانا عبد الرؤف صاحب جھنڈانگری رحمۃ اللہ علیہ کا خط سرِ فہرست ہے۔آپ لکھتے ہیں......

''آپ کا اخبار دیکھ کر اور آپ کے دو مضامین پڑھ کر مجھ کو دلی خوشی ہوئی کہ اس میں آپ اپنے قلم کے سہارے گویا بول رہے ہیں۔ فصاحت و بلاغت اور لطافت سب ساتھ ملی جلی ہیں جو آپ کے کلام کی خصوصیت ہے۔''

آپ الفاظ کے بڑے دھنی ہیں۔جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں لفظوں کا انبار لگا دیتے ہیں۔آپ کے ذہن کی memory میں مترادفات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود ہے جسے وہ خطابت اور صحافت دونوں میں حسب موقع ومحل اس طرح استعمال کیا کرتے ہیں کہ قاری اور سامع آپ کے الفاظ کی چاشنی اور جملوں کے درو بست کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتا ہے۔خبر نامہ کے تیسرے شمارے کا اداریہ ''اے ملت خوابیدہ جاگ'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ اس میں آپ نے پورے ملک خاص طور سے اتر پردیش کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کس اسلوب کا استعمال کیا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں......

''اس موقع پر ہم مسلمانوں کو وہی پیغام سنانا چاہیں گے جسے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہمارے آقا، ہمارے محسن، ہمارے قائد، ہمارے رہبر اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی ریگستانی سرزمین، حرمین شریفین کی وادیوں اور کھجوروں کے پاکیزہ شہر سے، ام القریٰ کی فضاؤں اور جبریل امین کے مہبط خاص سے ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کو سنایا تھا کہ اے مومنو! اللہ نے عرش اعظم سے تمہارے لیے مژدۂ عظیم کا اعلان فرمایا ہے......اے میرے بندو! سست گام، پست حوصلہ، مایوس وغمگین نہ ہو۔کائنات ہست وبود میں تمہی سربلند رہو گے بشرطیکہ اسلام وایمان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔یہی پیغام آج بھی ہمیں جرأت وہمت اور حوصلہ عطا کر رہا ہے۔ ہمارے ارادوں کو ہمالہ کا استحکام بخش رہا ہے۔ ہمارے ایمان

ویقین کے گلزار پر تازگی وشادابی کی بہار نثار کر رہا ہے۔ ہماری عظمت رفتہ اور شوکت گزشتہ کی واپسی کا افسانہ سنا رہا ہے۔ ہمارے اقتدار واختیار اور حکومت وسلطنت کا نسخۂ ہدایت پیش کر رہا ہے۔ مسلمانو! تمہارے وجود کی اس خاکداں کو آج بھی ضرورت ہے۔ زمانے کو تمہارے اقتدار حق شعار کا انتظار ہے۔ آج بھی وقت کے کسریٰ وقیصر کے تخت وتاج تمہاری راہ تک رہے ہیں۔ دریا کے دھارے، ہواؤں کے جھونکے، گنبد نیلوفری کے انجم وکہکشاں، آفتاب وماہتاب کی شعاعیں، پہاڑوں کی بلندیاں، شب وروز کی داستانیں، گل زار وچمن زار کی روشیں، لالہ وگل کی رعنائیاں، بلبل ہزار داستان کے نالے سب تم پر نثار ہونے کو تیار ہیں۔ جام جمشید، عدل نوشیرواں، سخاوت حاتم، حشمت دارا، شوکت خاقاں، فرِ کسریٰ اور عظمت کیانی سب تمہارے وجود کے تصور سے لرزہ بر اندام ہیں۔ تمھی نے دنیا کو تہذیب وتمدن دیا۔ تمھی نے زمانے کو جہاں بانی کا درس دیا۔ انداز حکمرانی سے روشناس کرایا۔ منظر عام پر تم نہیں ہو گے تو کچھ نہ ہوگا۔ نہ رونق رہے گی نہ شادابی، نہ حسن رہے گا نہ خوبصورتی، نہ زیبائش رہے گی نہ آرائش، نہ برنائی رہے گی نہ نزہت، نہ شیرینی رہے گی نہ چاشنی، نہ روشنی رہے گی نہ اجالا۔ آج بھی دنیا کو تمہارے وجود کی ضرورت ہے۔ تمہارے اخلاق، تمہاری تہذیب، تمہاری حکمرانی وجہاں بانی، تمہارے اسلوب عدالت، طرز شجاعت کی زمانے کو ضرورت ہے۔ اس لیے ہم عرض کریں گے کہ وقت بہت بیت چکا ہے، تم بہت سو چکے ہو، اب سونے کا وقت نہیں، زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا، مگر تم وہیں کے وہیں ہو......

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال وپر ہیں

پس انگڑائی لے کر اٹھو، ہوش وحواس درست کر کے اٹھو، بیداری کا وقت

آ گیا ہے، رات بوریا بستر باندھ چکی ہے، صبح صادق طلوع ہو رہی ہے، شاہ خاور نکلنے والا ہے۔ آؤ ایک بار پھر دنیا کو جلوہ زار بنادو، زمانے کو اپنے جاہ وجلال دکھادو، فضاؤں میں اپنا علم لہرادو، مظلوم ومعذور کی قسمت سنوار دو، ایک بار پھر شرافت وانسانیت کو آب حیات پلادو۔"

الفاظ کے در وبست اور مترادف جملوں کے استعمال کی ایک اور مثال عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے تعارف میں لکھی گئی ان سطور سے ملاحظہ کیجیے......

"عیدالفطر اگر رکوع وسجود، قیام وقعود اور عبادت وبندگی کا سرچشمہ ہے۔ تشنہ لب رہ کر خدا کی یاد اور تلاوت قرآن عظیم کا مظہر ہے۔ تطہیر قلب اور ذہن ودماغ کو مجلّٰی ومصفّٰی کرنے کا زریں سلسلہ ہے۔ پیکر خاکی میں ایمانی روح اور اسلامی حرارت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تو عیدالاضحیٰ پیغمبر اعظم وآخر، ہادئ عالم، فخر بنی آدم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قابل احترام جد امجد، پیغمبر زمانہ، حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے عشق وجاں سپاری وفداکاری کا مہینہ ہے۔ جذبات واحساسات کی قربانی کا مہینہ ہے۔ حکم الٰہی پر سر جھکا دینے کا مہینہ ہے۔ خدائے پاک کی خاطر سارے زمانے سے عداوت ودشمنی مول لینے کا مہینہ ہے۔ خدا کے دو پاکیزہ اور معصوم بندوں کے پاکیزہ جذبات عشق ومحبت کی پاکیزہ تاریخی یادگار کا مہینہ ہے۔"

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ آپ مولانا آزاد کے اسلوب کے مداح ہیں اور چونکہ خود بھی ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں جہاں مولانا آزاد کے انداز نگارش کی جھلک ملتی ہے وہیں ان کے جملے بہ بانگ دہل یہ کہتے بھی نظر آتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر انجم کا اپنا اسلوب ہے ان کا اپنا طرز نگارش اور طرز تحریر ہے۔ وہ اگرچہ مولانا آزاد اور مولانا فارقلیط کے قلم کے مداح اور شیدا ہیں وہیں ان کا نظریہ یہ بھی ہے کہ کسی کے قلم کی پیروی اس انداز سے نہیں کرنی چاہیے کہ اس کا اپنا رنگ نظر نہ آئے اور ممدوح کا رنگ غالب ہوتا دکھائی دے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں ان کا اپنا رنگ جھلکتا ہے۔ مثال

کے طور پر دوماہی خبرنامہ کے اداریے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں......

''ہائے مسلمانو! تم کیا تھے کیا ہو گئے۔ تمہارے اسلاف کا جذب دروں کہاں کھو گیا؟ تمھارا ساز ایمانی کہاں گم ہو گیا؟ تمہاری اذانوں سے روح بلالی کیوں غائب ہو گئی؟ تمہارے ہاتھ بے شمشیر اور تمہارے ہونٹ بے تکبیر کیوں ہو گئے؟ کل تم نے دنیا کو زندگی بخشی تھی۔ آج تم خود زندگی کے محتاج ہو گئے ہو۔ کل تک تمھارا وجود ہمالہ پہاڑ جیسا تھا آج تم خس وخاشاک کی طرح سطح آب پر تیر رہے ہو پھر بھی مست مئے ذوق تن آسانی ہو۔''

''ناداں نہ بنو مرد مسلماں سے نہ کھیلو'' کے عنوان سے ایک مضمون میں بڑے جذباتی انداز میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے سوتیلے سلوک کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ فسادات کی آگ میں ان کی املاک کو تباہ و برباد کر کے انہیں اپنے ہی ملک سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ پورا مضمون قابل مطالعہ ہے۔ اس کے چند اقتباسات پیش ہیں......

''برصغیر ہندوستان کی سرزمین پر تقریباً پینتالیس سالوں سے مسلمانان ہند کے قتل عام کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک دسیوں ہزار فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا چکا ہے۔ اربوں کی جائداد واملاک لوٹ کر برباد کر دی گئی ہیں۔ بے شمار مستورات کی بے حرمتی کی گئی ہے، ان کی عصمتوں سے کھلواڑ کیا گیا ہے۔ لاتعداد معصوم بچے جلا کر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے ہیں۔ کتنوں کو شمشیروں اور نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا ہے، کتنوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا ہے، کتنے بزرگوں اور نوجوانوں کو سر بازار رسوا کیا گیا ہے، کتنے معصوموں اور بے گناہوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے سے آج بھی یہ ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں۔ فسادات کا سلسلہ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ آج یہاں تو کل وہاں اور

پرسوں کسی اور جگہ۔ غرضیکہ مسلمانوں کو فسادات سے چھٹکارا نہیں۔ مسلمانوں کو لوٹنا پیٹنا، مارنا، جلانا اور قتل کرنا شرپسند عناصر کا مشغلہ بن گیا ہے۔ ان کو بڑی تکلیف ہے کہ مسلمان ختم کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ بھارت ورش کی پوتر دھرتی سے اپنا رشتہ ناطہ کیوں نہیں توڑتا۔ ہم اسے جتنا ہی تباہ و برباد اور بے دست و پا بنا دینا چاہتے ہیں اتنا ہی وہ سخت جان ثابت ہو رہا ہے۔ بجائے گھٹنے کے اس کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا چمن زار حیات دن بہ دن شاداب و پر بہار ہوتا جا رہا ہے۔ اس احساس کے تحت وہ اب جب کبھی حملہ کرتے ہیں تو پوری شدت و طاقت کے ساتھ کہ شاید اب کے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ جائیں اور بھارت ورش سے راہ فرار اختیار کر جائیں۔''

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ فسادات کے موقع پر پی اے سی کا استعمال کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کو لوٹنے اور مسلم خواتین کے تقدس سے کھیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی مگر مسلمان عزم و ہمت اور استقلال کے ساتھ ان تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ ہمت و عزیمت کے قصوں سے بھری ہے۔ (خیال رہے کہ اتر پردیش میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پی اے سی کی جانبداری بارہا اجاگر ہوئی ہے اور پولیس کے ایک اعلیٰ افسر وی این رائے نے پولیس و پی اے سی کی فرقہ واریت اور جانبداری کا کچا چٹھا اپنی کتاب میں کھولا ہے)۔

اس طرح اگر ہم ان کے صحافتی سفر کا جائزہ لیتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ ایک جرائتمند، بیباک، بے خوف، بے لاگ اور حق گو صحافی تھے۔ انہوں نے سچ بات کہنے میں کبھی کوئی خوف محسوس نہیں کیا اور نہ ہی کبھی مصلحت کوشی کو دامن گیر ہونے دیا۔ وہ مصلحت سے ہمیشہ دور رہے اور جس بات کو سچ سمجھا اس کو بہ بانگ دہل کہا، کسی سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب اور صحافی ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا خزینہ ہے اور الفاظ ان کے آگے دست بستہ

کھڑے رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مترادفات کا بے محابہ استعمال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ الفاظ کے دھنی ہیں اور انہیں اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے دوسروں سے الفاظ ادھار نہیں لینے پڑتے۔ مقام افسوس ہے کہ وہ اپنے صحافتی مشن کو زیادہ دنوں تک جاری نہ رکھ سکے اور مالی دشواریاں ہمیشہ ان کے آگے آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اگر وہ چاہتے اور آج کے نام نہاد صحافیوں کی مانند اپنے ضمیر وظرف کا سودا کر لیتے تو وہ صحافت کے میدان میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ لیکن انہوں نے ضمیر کا سودا گوارہ نہیں کیا اور اپنے قلم کی حرمت کو کبھی بھی پامال ہونے نہیں دیا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اخبار بند ہو جاتا ہے تو ہو جائے، وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی بھی اخبار دو چار سال سے زیادہ نہیں نکلا۔ انہوں نے اس شکست کو تسلیم کیا لیکن حق کی شکست کے لیے وہ کبھی تیار نہیں ہوئے۔ تاہم وہ اپنی صحافتی مہم سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کے مضامین ملک کے مذہبی اور معیاری اخباروں میں شائع ہوتے رہے اور وہ قارئین سے داد وتحسین کا خراج وصول کرتے رہے۔

○○

خطباتِ انجم

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم ایک منفرد خطیب و مقرر بھی ہیں۔ سماجی اصلاح کی کوششوں کا کام وہ اپنے خطبات سے بھی لیتے ہیں۔ وہ بے حد پر اثر انداز میں اپنی بات رکھتے ہیں۔ وہ تحریر ہو یا تقریر دونوں میں اپنی خوبصورت زبان کی وجہ سے چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنی تحریروں کو مترادفات کے موتیوں سے سجاتے ہیں اسی طرح ان کی تقریریں بھی انتہائی سحر انگیز اور دل میں اتر جانے والی ہوتی ہیں۔ ایک ہی موضوع پر کئی کئی گھنٹے تک بولنے کا انہیں ملکہ حاصل ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذہبی موضوع ہو یا سیاسی اور سماجی، ہر موضوع پر مدلل انداز میں اور خوبصورت اسلوب میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان اسلامی افکار و نظریات کی روشنی میں سماجی اصلاح کا میدان ہے۔ وہ رسوم و رواج اور غیر اسلامی روایات کے سخت مخالف ہیں اور مسلم معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی بے شمار تقریریں اور تحریریں ہیں جو لوگوں کے دلوں میں ایمان و یقین کی حرارت پیدا کرتی ہیں اور سنت نبوی پر عمل پیرا ہونے کی شمع جلاتی ہیں۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کے بیشتر خطبات ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں۔ البتہ ان کی تحریریں جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں اور جو انھوں نے اپنے رسالوں کے لیے لکھیں ان میں سے کچھ ضرور موجود ہیں، حالانکہ اس کا بھی بڑا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ تاہم ان کے خطبات کے کچھ نمونے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں جس سے ان کے انداز خطابت کا کچھ اندازہ ضرور ہو جائے گا اور قارئین خود اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جناب انجم انصاری منفرد لب و لہجے کے خطیب

ہیں اور ساتھ ہی وہ الگ انداز کی نثر لکھتے ہیں اور ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ان کی انشا پردازی کے نمونے مشت از خروارے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

اسوۂ حسنہ

اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ نے اپنی پاک و بابرکت، بہتر و برتر، عظیم المرتبت و رفیع المنزلت کتاب قرآن مجید وفرقان حمید میں ارشاد فرمایا ہے: لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (اے مسلمانو!) تمہارے لیے رسولؐ پاک کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ ایسا نمونہ جس کی پیروی ہر مسلم و مؤمن کے لیے ضروری ہے۔ انسانی زندگی میں، جو مختلف شعبوں میں منقسم ہے، اس نمونہ کی اہمیت و ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ بغیر اس نمونہ کی موجودگی کے ایک مومن و مسلم کی زندگی معیاری اور آئیڈیل زندگی نہیں ہو سکتی۔ زندگی ایک شجر شاخ در شاخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی آبیاری کے لیے اسوۂ حسنہ کے ابر گہر بار کی ضرورت ہے۔ زندگی کے جس کسی گوشے کو آپ لیجئے اس کے لیے اللہ پاک کے نبیؐ محترم کے پاک اسوہ کی اتباع کی ضرورت پڑے گی۔ عبادت و اطاعت، اخلاق و اخلاص، کردار و گفتار، تجارت و صنعت، معیشت و معاشرت، زراعت و سیاحت، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، عدالت و حکومت، غرضیکہ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں روشنی کے لیے اللہ پاک کے نبیؐ محترم کے آفتاب رسالت سے اکتسابِ نور کرنا ہوگا۔ زندگی کے ہر ایک شعبے میں رسولِؐ اکرم کی ہدایت و رہبری کی ضرورت محسوس ہوگی بغیر اس کے زندگی عمدہ، بہترین اور شاندار نہ ہو سکے گی۔ اسوۂ حسنہ کی شمع فروزاں انسانی زندگی میں روشن نہ ہو تو پھر زندگی اندھیروں میں بھٹکتی پھرے گی۔ اگر وہ شمع روشن ہے تو پھر کیا کہنا۔ سبحان اللہ! زندگی ایک معیاری زندگی ہوگی، مثالی زندگی ہوگی، آئیڈیل زندگی ہوگی۔ جو کوئی اپنی حیات مختصر کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں گزارنے کی کوشش کرے گا اس کی زندگی کا ماحول انتہائی شاداب اور خوبصورت ہوگا کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جہاں اسوۂ حسنہ کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

پیغمبر غارِ حرا، پیشوائے جن وانس، ہادیٔ اعظم، رسولؐ مقبول، حبیبِ کبریا، محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی رہبری و رہنمائی کے لیے انسانِ کامل کی زندگی مکمل کا نمونہ پیش فرمایا ہے اور اسی نمونے کی پیروی کا حکم اپنی امت کو بھی عطا کیا ہے اگر کسی نے دیدہ و دانستہ اسوۂ حسنہ اور کردارِ حیاتِ نبوی کی پیروی نہیں کی تو بلاشبہ وہ ضال اور گمراہ ہوگا اور اس کی زندگی ناتمام و نامکمل ہوگی۔ مہد سے لحد تک، بچپن سے بڑھاپے تک، صبح سے شام تک زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کے رسولِ کریم، رؤف و رحیم اور صاحبِ الطافِ عمیم، سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے شمس و قمر کی تابانی و درخشانی کی اس زندگیِ ناپائدار میں قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔ زندگی صرف اور صرف اسوۂ حسنہ سے معمور اور اسی کے نور سے منور ہوگی۔ بیرونِ خانہ ہو کہ اندرونِ خانہ، صحنِ مسجد ہو کہ کمرۂ عدالت، تجارتی بازار ہو کہ صنعتی میدان، جنگ و جہاد کا محاذ ہو کہ صلح و امن کا ماحول۔ تبلیغی پروگرام ہو کہ دعوتی لائحہ عمل، اخلاق و اطوار کی محفل ہو کہ گفتار و کردار کی مجلس، ہر ایک کے لیے بالیقین اسوۂ حسنہ، اسوۂ نبوی، اسوۂ محمدی کی ضرورت پڑے گی، ضرور پڑے گی!

اہل و عیال کے ساتھ زندگی کیسے بسر کی جائے، احباب و اخوان، ہمسایہ اور پڑوسی کے ساتھ کس طرح سلوک کیا جائے، سفر و حضر میں کیسے بود و باش اختیار کی جائے، مسجد و معبد میں کیا سلیقہ اپنایا جائے، ماتحتوں اور ملازموں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے۔ اپنوں اور غیروں کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اپنایا جائے۔ بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ کیسے رہا جائے۔ غرضیکہ کس کس طرح زندگی گزاری جائے، ان سب کا اسلوب و طریقہ، طرز و انداز اور رنگ ڈھنگ سرورِ کونین رحمتِ دارین رسول الثقلین امام القبلتین، سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوۂ پاک سے معلوم ہو سکتا ہے ہدایت و رہنمائی وہیں سے مل سکتی ہے۔ روشنی اور اجالا وہیں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے ممتاز انشا پرداز، منفرد مورخ، بے مثال اہل قلم، اسلامیات کے بحر العلوم عظیم المرتبت سیرت نگار، دانشکدۂ شبلی کے فارغ الاصلاح، دار العلوم ندوۃ العلماء کے مستند فاضل

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور عالم کتاب ''خطبات مدراس'' میں محبت وعقیدت کے بحر بے پایاں میں ڈوب ڈوب کر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے چنانچہ سید صاحب رقم طراز ہیں......

''اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر ایک نظر دوڑاؤ اگر تم شکست خوردہ ہو تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کے منادی کا فریضہ انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمھارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی نظم ونسق کو درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کا کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشے کو نہ بھولو، اگر بچے ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصرہ کے کاروانِ سالار کی مثالیں ڈھونڈھو، اگر عدالت کے قاضی پنچایت کے ثالث ہو تو کعبہ میں نورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبے کے ایک گوشے میں کھڑا کر رہا ہے مدینہ کی کچی مسجد میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی سیرتِ پاک کا

مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ و حسینؓ کے نانا جان کا حال پوچھو۔ غرض تم جو کوئی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمھاری زندگی کے لیے نمونہ تمھاری سیرت کی درستگی و اصلاح کے لیے سامان تمھارے ظلمت خانے کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہی ہے، ہدایت کا نمونہ نجات کا ذریعہ وہی ہے۔''

پس اے حجازی مسلمانو! اللہ کے بندو توحید کے فرزندو، رسولِ پاکؐ کے امتیو! دین کے شیدائیو، شریعت کے نام لیواؤ، حرم کے پاسبانو، انسانیت کے فرزانو، عشق محمدؐ کے دیوانو، قرآن و ہدایت کے علمبردارو، ملتِ اسلامیہ کے غمخوارو، چمن زار حیات کی بہار و آسمان بشریت کے چمکتے ہوئے ستارو، آؤ بصد ذوق وشوق آؤ اللہ پاک کو حاضر و ناظر جان کر اور اس کی توحید کو کما حقہ مان کر صمیم قلب و خلوصِ دل کے ساتھ عہد کرو اور مستحکم عہد کرو، نا قابلِ تنسیخ عہد کرو کہ ہماری زندگی نبیؐ پاک کے اسوہ کی روشنی میں بیتے گی، سرورِ عالم فخر دو عالم کے اتباعِ کامل کی روشنی میں بیتے گی، کوہِ فاران کے مبلغ کوہِ صفا کے واعظ کی اطاعت و فرمانبرداری کی روشنی میں بیتے گی، غارِ حرا کے پیغمبر اعظم و آخر کے عشق و محبت کی روشنی میں بیتے گی۔

جی ہاں! یہ عہد کرو اب ہماری زندگی اسوۂ حسنہ کی صاف و شفاف چاندنی میں بیتے گی۔ اب ہماری زندگی اسوۂ حسنہ کے ابر گہر بار کی پھواروں میں بیتے گی اب ہماری زندگی اسوۂ حسنہ کے چمن زاروں اور اس کی پاکیزہ و سرمست بہاروں میں بیتے گی، اب ہماری زندگی اسوۂ حسنہ کے آفتاب و ماہتاب کی سیمیں چاندنی اور زریں کرنوں میں بیتے گی، اب ہماری زندگی اسوۂ حسنہ کے گلاب و لالہ سنبل و ریحان کی پاکیزہ خوشبوؤں میں بیتے گی، اب ہماری زندگی اسوۂ حسنہ کی بادِ صبا کے جھونکوں اور نسیمِ بہار کی خوشگوار ہواؤں میں بیتے گی.......... اور جس کی زندگی اسوۂ حسنہ اسوۂ نبوی، اسوۂ محمدی کے جلو میں گزرے گی اس کی عظمت و رفعت اور اس کی قدر و قیمت کے کیا کہنے۔ مسلمان جب بھی اس بات کا عہد کرے گا کہ ہماری حیاتِ مستعار صرف اور صرف اسوۂ محمدِ عربی کی پیروی

ہے ربِّ کعبہ کے عرش معلیٰ سے رحمتِ کردگار کے مقدس فرشتے اس کا استقبال کرنے کے لیے فرشِ زمین پر اتر آئیں گے اور ہمارا ماحول مشکبار و نافہ زار ہو جائے گا اور زندگی شاداب و حسین اور خوشگوار ہو جائے گی۔ اور یہ سارا جہاں باغ و بہار، گل و گلزار اور نمونۂ خلد زار بن جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ! اس میں ذرا شک نہ کیجئے اور سرمستی کے انداز اور جذب و جنوں کے عالم میں ایک بار سب لوگ مل کر بیک زبان و بیک آواز نعرۂ مستانہ بلند کیجئے اسوۂ نبوی زندہ باد، اسوۂ حسنہ زندہ باد۔ اسوہ محمد زندہ باد۔ فصلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم............! (اگست ۱۹۹۱)

عشقِ رسولؐ کے پاکیزہ جذبات

ایک مسلمان کے لیے سب سے قیمتی متاع اور بیش بہا سرمایہ رسولؐ اکرم کی محبت ہے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ خدا کی قسم وہ شخص مسلمان نہیں ہے جس کے دل میں میری محبت اس کے ماں بہن، باپ بھائی، دوست احباب، عزت و آبرو، دولت و ثروت ہر ایک چیز سے زیادہ نہ ہو۔

ایک بار حضرت عمرؓ آنحضورؐ کے ساتھ چل رہے تھے، عمرؓ کا ہاتھ آنحضورؐ کے ہاتھ میں تھا باتوں ہی باتوں میں عقیدت و محبت کی رَو میں بہہ کر کہہ گئے یا رسولؐ اللہ! مجھے اپنی جان کے علاوہ اس دنیا میں آپؐ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہے۔ اس جملہ کو سن کر سرورِ عالمؐ نے فرمایا عمر! کیا کہتے ہو جب تک کوئی شخص دنیا جہاں سے زیادہ مجھ سے محبت نہیں کرے گا وہ سچا مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔ عمرؓ نے والہانہ انداز میں عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اگر ایسی بات ہے تو اب میری جان سے بھی بڑھ کر آپ محبوب ہیں اب میرے دل میں آپ سے زیادہ نہ کسی کی محبت ہے نہ کوئی آپ سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں اے عمر اب تم صحیح طور سے مسلمان ہو۔

صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جناب عروہ بن مسعود ثقفیؓ حاضرِ دربارِ رسالت ہوتے ہیں۔ صلح کے موضوع پر رسولِ اکرمؐ سے گفتگو کرتے ہیں۔ اثنائے گفتگو ایک بار کہہ جاتے ہیں کہ آپ کے پاس اے محمدؐ شریفوں کی جماعت نہیں دیکھ رہا ہوں اگر کوئی خاص موقع آ گیا تو یہ لوگ جان بچا کر بھاگ جائیں گے (خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا) پھر ایک موقع پر دورانِ گفتگو عرب کے طرز کے مطابق عروہ آنحضورؐ کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کچھ کہنا چاہتا ہے اتنے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ نے جو ایک اسلامی مجاہد کی شکل میں پاس ہی کھڑے تھے، انھوں نے تلوار کا قبضہ عروہ کے ہاتھ پر مار کر کہا اپنا ہاتھ میرے سرکار کے ہاتھ سے پرے رکھو۔ عروہ نے پوچھا یہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا مغیرہ بن شعبہ۔ عروہ نے کہا: او غدار میں آج تک تیری غداری کی سزا بھگت رہا ہوں اور تیرا یہ برتاؤ۔ الغرض عروہ آنحضرتؐ سے گفتگو کرتے جاتے تھے اور اصحابِ کرام کے برتاؤ کو بھی نظر بچا بچا کر دیکھتے جاتے تھے۔ جب یہ واپس کفار کی محفل میں پہنچے تو کہا......

''اے لوگو! میں بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں گیا ہوں لیکن جو انداز میں نے اصحابِ محمدؐ کا دیکھا وہ بادشاہ کے درباریوں کا نہیں دیکھا۔ جیسی عزت و تکریم اور ادب و احترام ان کے ساتھی محمدؐ کا کرتے ہیں ویسا ادب و احترام کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں کرتے۔ ارے میں نے دیکھا ہے کہ جب وہ تھوکتے ہیں تو ان کا تھوک جس کسی آدمی کے ہاتھ پر پڑتا ہے وہ فوراً اسے اپنے سارے بدن پر مل لیتا ہے۔ وہ جب کوئی حکم دیتے ہیں تو سب لوگ اس کو پورا کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کے وضو کا پانی لینے کے لیے آپس میں چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ پانی کا قطرہ زمین پر گرنے نہیں دیتے۔ جب وہ بولنے لگتے ہیں تو سب چپ ہو جاتے ہیں، ادب و احترام کی وجہ سے کوئی شخص ان کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ غرضیکہ میں نے کسی جماعت کا اپنے آقا کے ساتھ اور کسی درباری کا اپنے بادشاہ کے ساتھ اتنی محبت اور اتنا ادب و احترام نہیں دیکھا ہے''۔

آیئے عشق رسولؐ کا ایک دلکش اور دلگداز واقعہ ملاحظہ فرمائیں جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ واقعی محمد عربیؐ کے دیوانے، عشق رسولؐ کے مستانے اپنا اندازِ جنوں کس قدر عجیب وغریب اور کتنا پاکیزہ اور معصوم رکھتے ہیں۔

اسلام کی دوسری بے مثال جنگ، جنگ احد ہے۔ رسولؐ اللہ اس جنگ میں بہ نفسِ نفیس شرکت فرما ہیں، سپہ سالار کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اسلامی فوج کو کمانڈ کر رہے ہیں، مختلف ہدایات دے رہے ہیں، نصیحتیں فرمارہے ہیں اور جنگ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کُن موڑ لے رہی ہے، مسلمانوں کا پلہ بھاری پڑ رہا ہے۔ اللہ والے غالب ہو رہے ہیں، حزب الشیطان راہِ فرار ڈھونڈھ رہی ہے کہ دفعتاً مسلمانوں کی غلطی کی وجہ سے جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا اور مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ بہت سارے مسلمان شہید ہو گئے، زخمی ہو گئے، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے، گوہر مقصود کھو گیا درِّ مرغوب نظروں سے اوجھل ہو گیا.......... آناً فاناً یہ خبر مدینۃ النبی میں بھی پہنچ گئی اور پورے شہر میں ہلچل مچ گئی، زلزلہ آگیا، طوفان اٹھ گیا، مرد تو مرد عورتیں بھی گھبرا گئیں، بعض عورتیں غم واندوہ سے پریشان ہو کر جنوں کی حالت میں سرکار دو عالم تاجدار مدینہ کی محبت میں بیتاب ہو کر گھروں سے نکل پڑیں کہ میدان جنگ میں چل کر صحیح صورتِ حال معلوم کر سکیں۔ ایک انصاریہ خاتون بھی پریشانی کی حالت میں میدان جنگ کی طرف دوڑ پڑیں۔ آگے بڑھ کر دیکھا کہ کچھ لوگ جمع ہیں بے قراری سے پوچھا کہ رسولؐ اللہ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا ٹھیک ہیں۔ بحمد اللہ باحیات ہیں، البتہ تمھارے والد شہید کر دیے گئے۔ خاتون انا للہ پڑھ کر آگے بڑھ گئیں۔ پھر کچھ لوگ آتے ہوئے ملے پوچھا آقا کس حال میں ہیں، ان کی کچھ خبر ہے، لوگوں نے بتایا خدا کا شکر ہے بعافیت ہیں مگر تمہارا لخت جگر شہید کر دیا گیا۔ پھر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر آگے بڑھ گئیں۔ اب وہ میدانِ کارزار کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ ایک مجمع میں جا کر دریافت کیا۔ آقا و مولا حضورِ اقدسؐ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ کا شکر واحسان ہے آپؐ بخیریت ہیں، مگر تمھارا بھائی شہید کر دیا گیا ہے۔ خاتون انا للہ پڑھ کر بولیں جب تک اپنی ان آنکھوں سے آقا و مولا

رسولؐ پاک کی زیارت نہ کرلوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔ دریافت کیا گوہر مقصود کہاں ہے۔ ایک جانب اشارہ کیا گیا۔ وہ دوڑی دوڑی اسی جانب گئیں جہاں حضورؐ تشریف فرما تھے۔ قریب پہنچ کر حضورؐ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کیں تو دل کو کچھ تسکین ہوئی۔ جاں نثار بہادر خاتون کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے باپ، بیٹے، شوہر اور بھائی کی شہادت کی خبر دیتے ہوئے صبر کی تلقین فرمائی۔ بہادر انصاریہ خاتون نے دامنِ رسالت تھام کر کہا یا رسولؐ اللہ......

باپ بھی، بیٹا بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم؟

یہ ہے عشقِ رسولؐ کا پاکیزہ انداز، حب النبیؐ کا قابلِ تقلید نمونہ حضرت محمدؐ کے عشق و محبت کی لاجواب کہانی!

ایک صحابیؓ اللہ کے رسولؐ کے پاس حاضر ہوئے۔ عرض کیا، متی الساعۃ یا رسول اللہ؟ اے اللہ کے رسولؐ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: ما اعددت لھا (تم نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟) انھوں نے جواب دیا: ما اعددت لھا من کثیر صلوۃ ولا صوم ولا صدقۃ الکنی احب اللہ ورسولہ قال انت من احببت (اے رسول محترم! میں نے کوئی خاص تیاری نہیں کی ہے نہ تو میرے پاس زیادہ نماز روزہ ہی ہے اور نہ ہی صدقہ وخیرات، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اللہ اور اس کے رسولِ پاکؐ کی محبت سے میں سرشار رہتا ہوں۔ یہی ایک سرمایہ میرے پاس ہے اور تو کچھ نہیں ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: تم جس سے محبت کرتے ہو قیامت کے دن اسی کے ساتھ اور اسی کے پاس رہو گے۔)

حضرت انسؓ کہتے ہیں جو اس حدیث کے راوی ہیں: فما رأیت المسلمین فرحوا بشیٔ بعد الاسلام فرحھم بھا کہ مسلمانوں کو میں نے دیکھا کہ اس واقعہ کو سن کر جتنی خوشی انھیں ہوئی اسلام قبول کرنے کے بعد کسی اور چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ سارے اصحابِ محمدؐ میں اس خبر کو سن کر سرور وخوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، ہر مسلمان اپنی اپنی جگہ پر مست وسرشار ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ایسی دولتِ لازوال حاصل ہو گئی جس

کا اس جہاں میں کوئی جواب نہیں ہے۔ سچ ہے محبتِ رسولؐ سے بڑھ کر ایک مومن کے لیے کوئی اور دولت نہیں ہے۔ حب النبیؐ اور عشق محمدؐ کے بالمقابل تخت و تاج حکومت و سلطنت، لعل و گہر، سیم و زر، مال و دولت بلکہ ساری کائنات ہیچ در ہیچ ہے۔ بارگاہِ رسولؐ کے فرزانوں کو عشق محمدؐ کے دیوانوں کو اور شمعِ رسالت کے پروانوں کو اس بات کا خوب خوب علم تھا اور یہ نکتہ اچھی طرح معلوم تھا کہ رسولؐ پاک کی محبت کی دولت ہے تو پھر سب کچھ ہے۔ خدا ہے، اس کا رسولؐ ہے، جنت ہے، دیدارِ خداوندی ہے، رفاقت نبوی ہے، کیا نہیں ہے، سب کچھ تو ہے۔ اس لیے ایک مسلمان جسم و جان اور قلب و جگر کو قربان کر کے بھی محبت رسولؐ کی دولت کو محفوظ رکھتا ہے، سر کٹ جائے تو کٹ جائے کوئی بات نہیں، جان جائے تو جائے کوئی غم نہیں، عشق رسول کا جذبہ سلامت رہے اور بس!

ایک صحابی حضرت عبیداللہؓ بن یزید کا ذکرِ خیر ہے کہ وہ نبیؐ محترم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسولؐ اللہ مجھے آپ اپنے اہل و عیال اپنے جان و مال سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہیں۔ جب میں گھر میں ہوتا ہوں اور آپؐ کی یاد پاک آجاتی ہے تو جب تک آپؐ کے رخِ انور کی زیارت نہیں کر لیتا ہوں تب تک دل و جان کو قرار و سکون حاصل نہیں ہوتا تو میں گھر کے تمام افراد کو نظر انداز کرتے ہوئے بھاگم بھاگ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر آپ کے جمالِ جہاں آرا کا نظارہ کرتا ہوں اور دلِ بے قرار کو قرار آجاتا ہے۔ فراق محبوب کی گرمی زیارت محبوب کی خنک خنک شبنم سے سرد ہو جاتی ہے اور میں اپنے گھر اپنے بال بچوں میں واپس ہو جاتا ہوں۔ لیکن اے محبوبِ خدا، حبیبِ کبریا رسول محترم! جب اپنی موت اور آنجناب کے وصال مُبارک کی بات یاد آجاتی ہے اور عالمِ تصور میں سوچتا ہوں کہ آنجناب تو انبیاء کے درجۂ بلند فردوسِ بریں میں رونق افروز ہوں گے اور میں کسی طرح جنت کے کسی ادنیٰ مقام پر پہنچ ہی گیا تو وہاں پر حضور محترم کا دیدار پاک نہ ہو سکے گا۔ اس خیال سے انتہائی روحانی کرب و اذیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس جاں نثار کے بے قرار انہ پاکیزہ اور محبت افزا سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا اللہ کا کلام شاہد ہے سنو خدا کا

ارشاد ہے: من یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین و حسن اولئک رفیقا۔ یعنی ''جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولِ پاکؐ کی اطاعت کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ کا انعام ہو چکا ہوگا یعنی نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہوگا اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں۔'' اسی قسم کا ایک واقعہ اور ہے کہ ایک صحابیؓ نبیِ اکرمؐ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ ہی کی جانب ٹک لگائے دیکھتے رہے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: کیا بات ہے؟ کیوں مجھی کو دیکھے جا رہے ہو؟ انھوں نے عرض کیا میں سوچتا ہوں کہ دنیا ہی میں اس دیدار کی بہار کو کیوں نہ لوٹ لوں پتہ نہیں آخرت میں سعادت حاصل ہوگی کہ نہیں۔ کیونکہ آخرت میں آپؐ کے مقام بلند تک تو ہماری رسائی نہ ہو سکے گی اور ہم رخِ محبوب کی زیارت سے محروم ہی رہیں گے اس لیے اس وقت ہم آپ کی زیارت کر کر کے اپنے دلِ ناصبور کو پرسکون کر رہے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور عاشقانِ محبتِ کبریا کے زخم خوردہ دلوں پر سکون و اطمینان کے خنک مرہم کا پھایا رکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا فراقِ محبوب کے اندیشوں سے اضطرابِ قلبی و انتشارِ ذہنی کا شدت سے احساس کرنے والوں کی ڈھارس بندھ گئی اور غم دور ہو گیا۔

مشہور صحابیِ رسول حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک بار اللہ کے نبیؐ کی ایک خیّاط نے دعوت کی۔ میں بھی آنحضورؐ کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھا۔ جب کھانا تیار ہو گیا اور دسترخوان لگا تو میں نے دیکھا اس کھانے میں دیگر سامانوں کے ساتھ کدّو کی ترکاری بھی موجود تھی۔ حضورؐ اسے بڑی خواہش اور بڑے چاؤ سے کھا رہے تھے، پلیٹ میں تلاش کر کر کے اس ترکاری کو کھاتے جا رہے تھے اور میں سوچتا جاتا تھا کہ میرے پیارے پیغمبرؐ کو کدّو کی ترکاری کس قدر پسند ہے اور آپؐ کو کتنی محبوب ہے۔ کدو کی ترکاری مجھے کبھی پسند نہ آئی تھی میں نے ہمیشہ اسے ناپسند کیا اور کبھی کھاتا نہیں تھا مگر جب اپنے پیارے اور پاکیزہ رسولؐ محبوبِ خدا کو دیکھا کہ آپ کھا رہے ہیں تو مجھے یک گونہ

خفت محسوس ہوئی اور طے کرلیا کہ آج کی تاریخ سے میں بھی حب النبیؐ کے جذبہ سے برابر کھایا کروں گا، کبھی انکار نہ کروں گا۔ اس کے بعد حضرت انسؓ حضورؐ کے خادم خاص بڑے بڑے اہتمام سے کدو کی ترکاری منگواتے پکواتے اور کھاتے اور کبھی کبھی کھاتے جاتے اور کہتے جاتے: اے کدّو تو مجھ کو آج سے پہلے ناپسند تھا لیکن جب سے اپنے پیارے نبیؐ اور محبوب پیغمبر کو تجھے بڑے شوق سے کھاتے دیکھا تو میں نے بھی شوق و محبت سے تجھے کھانا شروع کر دیا۔ تو جب میرے حبیب، میرے محبوب اور میرے دوست کو پسند ہے تو مجھے کیوں نہیں پسند رہے گا۔

یہ ہے محبتِ رسولؐ کا جذبہ، یہ ہے عشقِ محمدؐ کا جذبہ، یہ ہے اطاعتِ نبوی کا پاکیزہ جذبہ جس سے ہر مسلمان کو سرشار ہونا چاہیے۔ اگر یہ پاکیزہ جذبہ امتِ محمدیہ کے رگ و پے میں پیوست ہو جائے تو پھر کیا کہنا۔ آج بھی وہ پاکیزہ انقلاب وقوع پذیر ہو سکتا ہے جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاکیزہ زمانے میں معرضِ وجود میں آچکا ہے جس کا سارے زمانے نے مشاہدہ کیا ہے......! آج بھی زمانہ اسی انقلاب کے انتظار میں ہے۔ (جنوری ۱۹۸۸)

مصلح عالم کی ضرورت

یہ سچ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے چھ سو سال قبل تزکیہ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس سے بھی پہلے ہدایت ونجات کی شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ ''چراغِ طور'' بھی گل ہو گیا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی زرتشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس سے پہلے مہاتما بدھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں ''روح کا دارالامن'' ڈھونڈا تھا مگر حوادث زمانہ نے اس کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری

قوم سے برسر پیکار، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا۔ حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی۔ نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی۔ عدل و راستی اور پاک بازی کے عطر معنبر کی خوشبو انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی۔ توحید و خدا پرستی کا نور دیوی دیوتاؤں، ستاروں، شہیدوں، بتوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر ظلمت میں چھپ گیا تھا۔ غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصۂ دراز سے پراگندہ و منتشر ہو رہا تھا پھر نظم و انتظام پیدا کرے۔ روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پُر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلعِ انوار بنا دے۔ دفعتاً رحمتِ خداوندی کے بحرِ ناپیدا کنار میں ایک تموج بپا ہوتا ہے اور ۲۲ /اپریل ۵۷۱ء کو وہ ذاتِ گرامی ۹ ربیع الاول عام الفیل کی صبح صادق کو تخلیق کا جامہ پہنتی ہے جسے محمدؐ کے نام سے موسوم اور آگے چل کر رحمت للعالمین کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ عمر کی چالیسویں منزل پار کر لینے کے بعد اسے رسالت کا تاجِ زرنگار پہنا دیا جاتا ہے اور معلم انسانیت و مصلحِ عالم کا منصب عطا فرما کر توحید کی دعوت کو عام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ۲۳ سال کی مدت پوری ہوتے ہوتے فریضۂ نبوت ادا کر کے ربعِ عالم پر حکومتِ الٰہیہ کا پرچم لہرا کر راہی عالم جاودانی ہو جاتے ہیں۔ آپؐ نے اپنی تعلیم و تربیت سے ایک ایسا معاشرہ قائم فرما دیا جس کی مثال اس دنیا میں نہیں مل سکی ہے اور ایک ایسی جماعت برپا کر دی جسے اپنے کردار سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں پوری دنیا نہا گئی۔ وہی روشنی آج بھی فرزندانِ توحید کی راہوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔

اگر ہم سیرت سرورِ کائنات کا دل کی گہرائی سے مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ فتحِ مکہ کے وقت آپؐ کی کیا کیفیت تھی اور دعا کے وقت آپؐ کا کیا حال تھا، طائف کی وادی میں آپ پر کیا گزری۔ فتح مکہ میں آپ نے دشمنوں سے کیا سلوک کیا، اقتدار سے پہلے آپؐ کا کیا رویہ تھا، اقتدار کے بعد آپ کی کیا روش تھی، انصار مدینہ کے ساتھ آپ کا کیا

سلوک تھا، مہاجرین کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ وفود کے ساتھ آپ کس طرح پیش آئے، صلح و معاہدہ میں آپ کا کیا سلوک تھا؟ تو ہم خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ عالم انسانیت جس طرح دورِ نبوی میں آپ کی محتاج تھی۔ ٹھیک اسی طرح آج بھی محتاج ہے اور جب تک دنیا میں لیل ونہار کی گردش ہے محسن انسانیتﷺ کی سیرت کی ضرورت برابر محسوس ہوتی رہے گی۔ (مارچ ۱۹۸۸)

دو عظیم الشان تحفے

اللہ جل جلالہٗ عم نوالہٗ نے امتِ مسلمہ کے لیے دو عظیم الشان تحفے مخصوص کر رکھے ہیں جو سال بہ سال مسلمانوں کو عطا کیے جاتے ہیں، ایک ہے عید الفطر دوسرا ہے عید الاضحیٰ۔ دونوں عیدیں ہماری زندگی کے ایمان افروز خزینے ہیں۔ ہماری خوشی کے صاف و شفاف آئینے ہیں۔ ہمارے ایمان و امتحان کے پیمانے ہیں۔ ان دونوں عیدوں پر ہماری زندگی نثار ہے۔ یہ دونوں عیدیں ہماری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ہم انھیں پا کر خدا کی کبریائی اور اس کی عظمت کا نعرۂ وحدت بلند کرتے ہیں۔ اپنی جبینِ نیاز کو اس کی بارگاہِ خاص میں جھکا کر اس کی بندگی کا اعلانِ عام کرتے ہیں اور ان سے فیض حاصل کرتے ہوئے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔

عید الفطر اگر رکوع وسجود، قیام وقعود اور عبادت و بندگی کا سرچشمہ ہے۔ تشنہ و گرسنہ رہ کر خدا کی یاد اور تلاوتِ قرآنِ عظیم کا مظہر ہے۔ تطہیر قلب اور ذہن و دماغ کو مجلّٰی و مصفّٰی کرنے کا زریں سلسلہ ہے، پیکرِ خاکی میں ایمانی روح اور اسلامی حرارت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تو عید الاضحیٰ پیغمبرِ اعظم و آخر، ہادیٔ دو عالم، فخرِ بنی آدم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قابلِ ادب و احترام جدامجد، پیغمبر زمانہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام کے عشق وجاں سپاری و فداکاری کا مہینہ ہے۔ جذبات و احساسات کی قربانی کا مہینہ ہے۔ حکم الٰہی پر سر جھکا دینے کا مہینہ ہے۔ خدائے پاک کی خاطر سارے زمانے

سے عداوت و دشمنی مول لینے کا مہینہ ہے، خدا کے دو پاکیزہ اور معصوم بندوں کے پاکیزہ جذباتِ عشق و محبت کی پاکیزہ تاریخی یادگار کا مہینہ ہے۔

رمضان المبارک کا پاکیزہ و پر بہار مہینہ ہوا کے جھونکوں کی طرح سے آیا اور اپنی بہار دکھا کر جلوے بکھیر کر کائنات کو بقعۂ نور بنا کر واپس ہو گیا اب آئندہ پھر اسے اس کی زیارت نصیب ہوگی جو خوش نصیب ہوگا، تقدیر کا دھنی ہوگا، قسمت کا شہنشاہ ہوگا اور اس کے جمالِ جہاں آرا سے پھر کائنات جلوہ بار، جنت بکنار گلزار و مشکبار ہوگی مگر گیارہ مہینوں کے بیت جانے کے بعد ماہِ رمضان کی آمد سے کس کی زندگی بنی، کون لطف اندوز و فیضیاب ہوا، کون بجائے بننے کے اور بگڑ گیا ہر شخص سر بہ زانو ہو کر اس کا فیصلہ کر سکتا ہے اور ہر مسلمان یہ سوچ سکتا ہے کہ رمضان کی آمد سے اس نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

''عید الفطر'' کے کچھ ہی دنوں بعد دوسری اسلامی تقریب ''عید الاضحیٰ'' بھی آ گئی جو دو پیغمبروں کی ایمانی زندگی کے ابتلا و آزمائش کے نتیجے میں اللہ پاک نے مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے حصول میں مسلمانانِ عالم قدم قدم پر اپنے جذبات و احساسات، خیالات و نظریات کی قربانی پیش کرتے ہوئے، خدا کی عظمت و کبریائی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ کون و مکاں اور دونوں جہاں کو اس کا مشاہد قرار دیتے ہیں۔ خدا کرے مسلمانوں کی یہ قربانی، یہ نیاز، یہ نذرانۂ خلوص و تحفۂ محبت، یہ بندگی بارگاہِ خداوندی میں قبولیتِ عامہ کا شرف حاصل کر لے۔ آمین ثم آمین

''عید الاضحیٰ'' کا مہینہ گزرتے ہی ''محرم الحرام'' کا مہینہ آ جاتا ہے جو کہ اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے یہ مہینہ بڑا ہی باعظمت اور بزرگ ترین مہینہ ہے۔ اس مہینے سے بہت سی اسلامی تاریخیں و یادگاریں وابستہ ہیں۔ حضرت آدمؑ کی توبہ اسی مہینے میں قبول ہوئی تھی، حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے جور و ستم سے اسی مہینے میں نجات ملی تھی، کشتی نوح اسی مہینے میں لبِ ساحل پہنچی تھی، اسی مہینے میں قیامت بھی قائم ہوگی وغیر ذالک۔ (مئی ۱۹۹۲)

تاریخ اسلام کا ناقابلِ فراموش واقعہ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے زمانے کی بات ہے کہ تین آدمی سفر کر رہے تھے۔ ایک سُنسان بیابان میں پہنچے۔ سوئے اتفاق! بارش ہونے لگی۔ اسی وقت برق و باراں اور ہوائی طوفان کا آغاز بھی ہو گیا۔ موسلا دھار ہونے لگی۔ سفر کرنے والے بیچارے تینوں مسافر حیران و پریشان ہیں۔ پہاڑ کے ایک تاریک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی دیکھئے کہ دفعۃً پہاڑ کے اوپر سے ایک بہت بڑی چٹان لڑھک کر غار کے سوراخ پر آ کر ٹھہر گئی۔ مسافروں کے سامنے موت کا بھیانک نقشہ نظر آ رہا تھا اور وہ زندگی سے مایوس ہوئے جا رہے تھے۔ اس آڑے وقت میں کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ اگر کوئی ایسے مقام پر رہبری اور دستگیری کر سکتا تھا تو وہ خدا تھا۔ تینوں مجبور مسافر باہم کہنے لگے کہ بھئی دیکھو اس مصیبت عظمیٰ، آفت کبریٰ اور عذاب خداوندی میں اس بڑی چٹان سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ اور وسیلہ ہے! اور وہ یہ کہ اپنے سچے اور خلوص و نیک نیتی کے ساتھ کیے ہوئے اعمال و افعال کا واسطہ دے کر پروردگار عالم سے مؤدبانہ اپیل اور عاجزانہ درخواست کریں، ہو سکتا ہے اس بڑی چٹان سے چھٹکارا مل جائے، لیکن ہاں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اعمال ایسے ہوں جنھیں فی الواقع وسیلہ بنایا جا سکے۔ تینوں مسافروں نے متفقہ طور سے تجویز کو منظور کر کے دعا کرنے کا فیصلہ کیا اور ہر ایک نے باری باری سے دعا کا آغاز کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص انتہائی الحاح وزاری اور غایت عجز وانکساری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دست بہ دعا ہو کر مؤدبانہ انداز میں یوں گویا ہوا کہ:

مالک الملک، ذوالجلال والاکرام! تو علیم بذات الصدور اور سمیع بصیر ہے۔ تو میری نیک نیتی کو جانتا ہے میں بڑے خلوص کے ساتھ التجا کر رہا ہوں کہ میرا گزارہ صرف

بکریوں کی تجارت پر ہو رہا تھا۔ بکریوں کو چراتا تھا انھیں کے دودھ سے اپنی اور گھر کے تمام افراد کی پرورش کیا کرتا تھا۔ انھیں بکریوں کی آمدنی کے ذریعہ جملہ ضروریات کی تکمیل کی جاتی تھی۔ بچوں کے علاوہ والدین بھی تھے جو انتہائی نحیف، لاغر اور کمزور تھے۔ اگرچہ میں ان کی کما حقہ خدمات انجام نہ دے سکتا تھا لیکن باوجود اس کے میرا یہ دستور بن چکا تھا کہ جب تک دودھ میں اپنے ماں باپ کو پیٹ بھر کر پلا نہ دیتا تھا۔ بڑے تو خیر بڑے ہی تھے چھوٹوں کو بھی نہ دیتا تھا، اتفاق کی بات بکریوں کی خوراک کے سلسلہ میں پتے لینے کی خاطر اپنی آبادی سے دور جانا پڑا۔ واپس ہوتے ہوئے بہت دیر ہو گئی حتیٰ کہ میرے ماں باپ سو گئے، میں جب گھر آیا اور بکریوں کا دودھ دوہا اور سوچا کہ عادت کے موافق ماں باپ کو پہلے دودھ پلا دوں اس کے بعد کسی دوسرے فرد کو پلاؤں، چنانچہ دودھ لے کر میں اُن کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ سو چکے تھے۔ ادب کے پیش نظر ان کو جگا نہ سکا شاید کہیں تکلیف نہ ہو جائے۔ ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لیے ہوئے کھڑا رہا اور ان کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا یہاں تک کہ یونہی کھڑے کھڑے صبح ہو گئی۔ درانحالیکہ دوسرے افراد بھوک سے بے تاب تھے مگر میں نے کسی کی پروانہ کی۔ صبح کو جب والدین بیدار ہوئے اور ان کو دودھ پلا کر ان کا پیٹ بھر دیا تب میں نے تمام گھر والوں کو دودھ پینے کے لیے دیا۔

پروردگارِ عالم! فی الواقع اگر میں نے یہ سب کام تیری رضامندی کے ماتحت خلوص و نیک نیتی سے کیا ہے تو تو بھی آج ہم مصیبت زدہ مسافروں پر رحم و کرم فرما۔ ہم اپنے اس مخلصانہ عمل کو تیرے حضور میں وسیلہ بنا کر تیری رحمت کے امیدوار ہو کر تجھ سے التجا کر رہے ہیں کہ اس چٹان کو ہمارے سروں سے دور فرما دے۔

مخلص مسلمان کی عمل کے ساتھ مخلصانہ درخواست پر قاضی الحاجات و مجیب الدعوات نے اتنی مدد فرما دی کہ پتھر تھوڑا سا ہٹ گیا۔ لیکن صرف اتنا ہٹا کہ لوگ اس کے سوراخ سے باہر نہ نکل سکیں۔

پہلے شخص کی عرض گزاری کے بعد دوسرے مسافر نے بھی گڑگڑا کر درخواست پیش

کی: اے خلاق دو عالم، خداوند قدوس وغفور الرحیم! میری ایک چچا زاد حسین بہن تھی مجھے اس سے بیحد محبت تھی، لیکن کسی صورت سے بھی وہ میرے قابو میں نہ آتی تھی۔ اتفاق سے ایک سال قحط سالی کی وبا پورے ملک میں بڑے زور وشور سے پھیلی اس لیے مجبور ہو کر میری محبوبہ میرے پاس آئی اور میرے سامنے دست سوال دراز کیا۔ میں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ مجھے تمھاری امداد واعانت سے کوئی انکار اور عار نہیں ہے مگر ایک شرط ہے اگر تم اسے پوری کر دو تو تمھاری ہر تمنا اور ہر مراد میری بارگاہ دولت میں سند قبول حاصل کرے گی اور وہ یہ کہ تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ اس نے جبراً وکرہاً میری تکمیل مقصد کے لیے آمادگی کا اظہار اور وعدۂ وصل کا اقرار کیا تو میں نے کچھ روپے اسے دیئے اور وہ لے کر چلی گئی۔ جب حسب وعدہ اس نے مجھے ملاقات کا شرف بخشا اور میں نے اسے بہر صورت قابو میں کر لیا تو اس نے لرزہ براندام ہو کر گڑگڑاتے ہوئے ہانپتی ہوئی اور کانپتی ہوئی زبان سے مہر سکوت کو شکست دی اور ساکت و جامد فضا میں ارتعاش پیدا کر کے کہنے لگی۔ خدا کے بندے آج مجھے خدا کا خوف رہ رہ کے ستارہا ہے۔ میرے عقل و دماغ پریشان ہیں میرے قلب وشعور اور ضمیر سب اپنی اپنی جگہ مضطرب و بے قرار ہیں سوچتی ہوں کہ زندگی میں جس مالک کی کبھی بھی نافرمانی اور حکم عدولی نہ کی جس کی بندگی اور غلامی سے کبھی بھی سرمو انحراف نہ کیا آج اس کی اتنی بڑی نافرمانی پر آمادہ ہو رہی ہوں جس کے عذاب وعتاب کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آج اس ظالم پیٹ نے مجھے مجبور کر کے اس بات کے لیے آمادہ کیا ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ گناہ؟

مانتی ہوں کہ اس اندھیری رات، سنسان میدان اور نگاہوں سے محفوظ گوشۂ خلوت کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیا وہ میرا آقا و مولا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جو بلاشک وشبہ سینوں کے رازہائے خفتہ سے خوب واقف ہے۔ میں اسے نہیں دیکھتی ہوں لیکن وہ یقیناً مجھے دیکھتا ہے اور میرے ہر فعل کو جانتا ہے تو پھر یہ کتنی بُری اور ناروا جسارت ہے کہ اپنے خدائے جبار و قہار کے سامنے جان بوجھ کر اس کی نافرمانی کر رہی ہوں جس کے بطش شدید اور سخت پکڑ سے کوئی بڑے سے بڑا سرکش ظالم بھی نہیں بچ سکتا۔ جس کے آگے

نمرود، فرعون سبھی لاچار و بے بس ہیں۔

او میری مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے انسان! تو بھی تو ایک آدمی ہے۔ تجھے بھی خدا نے ہی پیدا کیا ہے۔ تیرا بھی آقا وہی ہے تجھے بھی مرنا ہے۔ مر کر پھر اٹھنا ہے۔ خدا کے سامنے تجھے بھی اپنے اعمال وافعال کا حساب دینا ہے۔ ہاں! تو بھی تو اس کا غلام ہے اور وہ تیرا حاکم و مالک ہے تو بھی اس سے ڈر کہ تجھے بھی ڈرنے کا حق ہے، کتنے افسوس وحسرت کا مقام ہے کہ تجھے گناہوں سے مسرت وخوشی حاصل ہوتی ہے۔ مجھے تو احساس گناہ ہی سے دہشت معلوم ہوتی ہے کاش یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔

سچ ہے دل کی بات اپنے اندر غضب کی تاثیر رکھتی ہے دل کی بات تھی جو دل سے نکلی تھی اور دل پر بغیر اثر کیے نہ رہ سکی۔ اس کی مخلصانہ تقریر نے میری ردائے غفلت کو تار تار کر دیا اور مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا میرا بھی دل خوف ودہشت کا مسکن اور خدا کی یاد کا معبد بن گیا۔ میں نے عہد و پیمان کیا اب گناہوں کے کنارے نہ جاؤں گا۔ بصدق وبخلوص دل میں نے توبہ واستغفار کیا اور لڑکی سے کہا او خدا کی بندی اور عبادت گزار لڑکی جا میں نے تجھے آزاد کر دیا اور درہم ودینار بھی معاف کر دیے۔

اے مالک الملک ذوالجلال والاکرام! تو دانا وبینا ہے اگر میں نے یہ کام محض تیری رضامندی وخوشنودی کے لیے کیا ہے تو آج اس خطرناک پتھر کو ہماری نظروں سے دور کر دے۔ دوسرے مسافر کی اس عاجزانہ آہ وفریاد کو سن کر خدا نے اتنا کرم کیا کہ پتھر پھر کچھ سرک گیا اور اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ گیا لیکن اب بھی کماحقہ نکلنے کی جگہ نہ ہو سکی تھی۔

تیسرے مسافر نے دونوں مسافروں کی مخلصانہ دعاؤں کے نتیجہ کے پیش نظر پرامید ہو کر کہا کہ: بارِ الٰہا! میں ایک مالدار آدمی تھا۔ ایک دفعہ کی بات ہے کچھ مزدوروں نے میرے یہاں مزدوری کی۔ کام ختم ہونے پر سب کے سب اپنی اپنی مزدوری لے گئے۔ مگر ایک آدمی نہیں آیا اور اپنی مزدوری چھوڑ کر نہ جانے کیوں چلتا بنا۔ جب میں نے اس کی مزدوری سے تجارت کرنی شروع کر دی اور اس کا حساب کتاب بالکل الگ رکھا، کچھ دنوں میں اتنی برکت ہوئی کہ شاید ہی کسی دوسرے کو ہوئی ہوگی۔ اونٹ گھوڑے،

بکریاں گویا کہ ہر قسم کے جانوروں کی بہتات ہوگئی۔ عمدہ عمدہ بلڈنگ اور مکانات کی کثرت ہوگئی۔ نوکر بہت کثیر تعداد میں ہو گئے۔ اسی طرح کچھ دن بیت گئے۔ ایک دن وہ مزدور جس کی مزدوری سے میں نے یہ سب تجارتی ترقی کی تھی، آیا اور کہنے لگا۔ میری مزدوری مجھے دی جائے۔ میں نے کہا یہ سب سامان یعنی بکریاں، اونٹ یہ مکانات وغیرہ سب تمہارے ہی ہیں لے جاؤ۔ اس نے کہا میاں مجھ غریب سے کیوں اس قدر مذاق کرتے ہو۔ میں نے انتہائی منت وسماجت کے ساتھ اسے سمجھایا کہ برادر من! بخدا سچ عرض کرتا ہوں یہ سارے ساز و سامان در اصل تمہارے ہی ہیں۔ دیکھو جب تم اپنی مزدوری چھوڑ کر چلے گئے تو میں نے اس سے تجارت کرنی شروع کر دی اور اس میں اتنی برکت ہوئی کہ آج تمہارے سامنے ہے۔ میری اس بات پر اس آدمی کو بمشکل یقین آیا اور اپنی مزدوری کے ماتحت جتنا سامان تھا سب کو اپنے قبضہ میں لیتا ہوا اپنے وطن چلا گیا۔

خدایا تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ سب کام تیری خوشنودی کے لیے کیا ہے تو اس کے واسطے سے عرض گزار ہوں کہ ہماری مصیبت کو دور فرما۔ مسافر کی مخلصانہ درخواست کو خدا نے قبول فرمایا اور مصیبت کے طوفان سے نجات بخشی یعنی پتھر ویسا ہی کھسک گیا۔ راستہ بالکل صاف ہوگیا۔ تینوں مسافر غایت عجز وانکساری اور انتہائی مسرت وخوشی کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے زمیں بوس ہو گئے اور موت کے تاریک غار سے نکل کر اپنی منزل مقصود کی شاہراہ پر رواں دواں اور خراماں چلے گئے۔

خدا کے دربار میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مگر ہے تو صرف عاجزی وانکساری اور خاکساری کی۔ خدا عجز وانکساری کو بے حد پسند کرتا ہے۔ آہ وزاری اور گریہ وبکا کے ساتھ پیش کی گئی درخواست کو ضرور قبول فرماتا ہے۔ یہ اس کا دستور العمل اور اصل الاصول ہے۔ اگر کوئی انسان ایسے امتحان وآزمائش کے دائرے میں پرکھنا چاہے تو میں دعویٰ سے عرض کروں گا اسے ضرور آزمالینا چاہئے۔ آج بھی اگر کوئی آہ وزاری سے خدا کے حضور میں درخواست کرے تو وہ ضرور خدا کی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔

مذکورہ بالا واقعہ پر نگاہ بصیرت شناس ڈالئے۔ غور وفکر اور فہم وشعور کی روشنی میں

سوچئے کہ اس واقعہ سے ہمیں کیا کیا درس ملتا ہے۔ ملت کی تاریخ کے اس زرین واقعہ کے اندر تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک خدمت والدین، دوسرے خوف خدا، تیسرے امانت و دیانت۔ دراصل ان میں کی ہر ایک چیز اپنے اندر کامیابی کی ضمانت رکھتی ہے۔ انسان والدین کی خدمت اور ادب و احترام کے ذریعہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ خوف خدا کے باعث جنت کا مستحق ہوسکتا ہے۔ امانت داری و دیانت شعاری کے پیش نظر دونوں جہان کی سرخروئی حاصل کرسکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ لوگ کامیاب بھی ہوئے ہیں دنیا بھی حاصل کی ہے اور دین بھی حاصل کیا ہے کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوسکتا۔ بشرطیکہ خلوص وللّٰہیت سے معرّا نہ ہوں۔ بھلا بتایئے مذکورہ واقعہ میں تینوں مسافروں نے اپنے اپنے عمل کا جو وسیلہ پیش کیا ہے اگر اس میں صداقت نہ ہوتی اور خلوص نہ ہوتا تو کیا کامیابی ہوسکتی تھی۔ ہرگز نہیں۔ فائز المرامی اور کامیابی کے لیے اخلاص اور للّٰہیت شرط ہے۔ وہ خدمت والدین، وہ خوف خدا، وہ امانت و دیانت نیز دیگر اسلامی فرائض کس کام کے ہیں جن میں اخلاص وصداقت نہ ہو۔ (فروری ۱۹۶۱)

○○

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجمؔ بنیادی طور پر عالم دین تھے۔ اس لیے جسمانی معالج ہونے کے بجائے انہوں نے روحانی معالج بننا پسند کیا۔ انھوں نے زندگی کا پیشتر حصہ معاشی تنگی میں گذارا۔ وہ الفقر فخری پر ایمان رکھتے تھے اور اللھم لا عیش الا عیش الآخرہ پر یقین بھی۔ آج وہ سرافراز ہیں، سرنگوں نہیں۔ مادی آسودگی سے دامن کشاں ہو کر اللہ کے اس بندے نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ ایک مومن کے لیے اس سے زیادہ فخر وابتہاج کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ (ابن احمد نقوی)

جناب انجم صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ قادر الکلام شاعر، سحر البیان خطیب، بہترین انشاء پرداز اور صحافی رہے ہیں۔ لیکن جلسوں اور کانفرنسوں میں ان کی شہرت بحیثیت شاعر زیادہ رہی۔ حمدیہ ونعتیہ شاعری اور بچوں کے لیے نغمے ان کا طرہ امتیاز ہیں۔ ان کی ولولہ انگیز نظموں میں انقلابی آہنگ اور جذبات کی فراوانی ہے۔ (شیخ صلاح الدین مقبول احمد)

یوں تو وہ انجم تھے لیکن ان کی ذات سراپا انجمن تھی۔ وہ حوصلہ منداور پُر بہار اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مایوسی و نامرادی، بے حسی و بے عملی، سستی و غفلت، افسردگی و شکستگی کو گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے پاس حوصلوں کی بجلیاں تھیں۔ وہ موج بے کراں تھے۔ وہ تیز گام تھے۔ ذوق وشوق اور عزم وحوصلہ کو جوان رکھنے کے لئے ہمیشہ بگل بجاتے رہے۔ (مولانا عزیز عمر سلفی)